چھیڑ غالب سے چلی جائے

ترتیب

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب!

مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا؟

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

عرض مرتب

غالب سے متعلق سوانحی تنقیدی اور تشریحی مواد تو بہت بڑی تعداد میں اہل ادب کے سامنے ہے لیکن اس کے فیضان کی کچھ اور راہیں بھی ہیں وہ تنہا شاعر ہے جو ہر شکل میں ہمارا ساتھ دیتا ہے۔ ہمارے فن کاروں نے چاہے وہ قلم کے ہوں یا موقلم کے جتنا کچھ غالب کے در سے پایا ہے کسی اور در سے نہیں پایا۔

شاعر بھی اور نثر نگار بھی سنجیدہ لکھنے والے بھی اور مزاحیہ لکھنے والے بھی مقرر بھی اور مصور بھی ان سب نے غالب کی متنوع شخصیت کے رنگ اڑائے ہیں اور اپنی اپنی تخلیقات کو سجانے اور سنوارنے کا کام لیا ہے۔ غالب کی شخصیت اور فن کا پہلا باقاعدہ تعارف کرانے کا سہرا مولانا حالی کے سر ہے۔ وہ اگر یادگار غالب جیسی عہد آفریں کتاب لکھ کر غالب پر سے پردہ نہ اٹھاتے تو شاید ہمیں یوں بھی اس کی صحیح قدر و قیمت کا احساس نہ ہوتا، انھوں نے اپنے بس بھر غالب کو اس ماحول میں اجاگر کرنے کی کوشش کی جو اسے برداشت کرنے کے لیے آمادہ نظر نہیں آتا اور جہاں اس کا مذاق اس انداز میں اڑایا جاتا ہے کہ:

کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اور اس سے پوچھا جاتا ہے کہ صاحب! آپ کے اس شعر کا مطلب کیا ہے:

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال پھر دوا جتنی ہو اس بھینس کے انڈے میں ڈال

اور کوئی ازراہ تمسخر و استہزا اس کے دیوان کو آمد نامہ کہہ کر اپنی تسکین کا ذریعہ تلاش کرتا ہے۔ اسی کا اثر تھا کہ اس نے گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کہہ کر اپنے آپ کو بساط ریختہ سے ایک عرصے کے لیے علیحدہ کر لیا تھا اور اس طنز و تشنیع سے پیدا ہونے والی جھنجلاہٹ کے تحت یہ بھی کہا تھا:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن اس تلخی کا ایک مثبت اثر بھی مرتب ہوا اور اس نوک جھونک کے نتیجے میں غالب نے اپنے کلام کا جائزہ لے کر مسودے سے بڑے حصہ اشعار کو قلم زد کر کے ایک صاف ستھرا دیوان پیش

کیا شاعر کے لیے انتخاب کا مسئلہ اپنے جگر پاروں کی تراش خراش کے مترادف ہوتا ہے؟ غالب کو اس انتخاب کے موقع پر کس آزمائش سے دوچار ہونا پڑا ہوگا اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خود بھی شعر کہتے ہوں۔

مولانا حالی ہی نے پہلی بار غالب کے اندر چھپے حیوانِ ظریف کو دریافت کیا تھا۔ اس دریافت کی بنیاد غالب سے حالی کے تعلقات تھے۔ خود غالب کے خطوط اور ان کے اشعار میں بھی جگہ جگہ ایسے نشانات مل جاتے ہیں جس سے اُس کی شوخی، ظرافت اور طبیعت کی شگفتگی کا پتہ چلتا ہے۔

صاحب عالم مارہروی نے اپنا مادۂ تاریخ ولادت لفظ تاریخ سے نکالا اور غالب کو بھیجا۔ تاریخ سے سنہ ۱۲۱۱ھ برآمد ہوتے ہیں، غالب کا سال ولادت ۱۲۱۲ھ ہے جو تاریخ پر الف بڑھا دینے سے نکل آتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے جواب لکھا تو ازراہ تفنن یہ شعر بھی لکھا۔

ہاتفِ غیب شب کو یوں چیخا   اُن کی تاریخ میرا تاریخا

اس جیسی کتنی ہی مثالیں خطوط غالب، یادگار غالب، آب حیات وغیرہ میں مل جاتی ہیں۔ غالب کو چھیڑ چھاڑ پسند تھی چنانچہ اس قسم کے اشعار سے مزاج کا اندازہ باآسانی ہوسکتا ہے۔

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی   گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی   سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ "یوں"

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین   ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا   وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو   کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن   دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

کیوں نہ دوزخ کو بھی جنت میں ملا لیں یا رب   سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ   جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری   تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

میں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیے ہوتے

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

یہ سارے اشعار غالب کی پیش دستی اور فاقہ مستی والے مزاج کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ غالب کے کلام کی یہی شوخی ہے جس نے اُسے مقبول بنانے میں خاصا حصہ لیا ہے۔ اور دوسرے فنکاروں کے ذہنوں کو غالب سے چھیڑ چھاڑ بھی سجھائی۔ چنانچہ غالب کے اشعار کی پیروڈی سب سے زیادہ کی گئی ہے۔ اُس کے اشعار کی بنیاد پر کارٹون تک بنائے گئے ہیں، چھیڑ چھاڑ کا یہ سلسلہ اُس کی زندگی سے آج تک چلا آرہا ہے۔ اردو اخبارات کے مزاحیہ کالموں میں خصوصیت سے غالب غالب نظر آتا ہے۔

غالب کو مزاحیہ رنگ میں استعمال کرنے کا رواج ریڈیو کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ اور بھی زیادہ ہو گیا۔ اور فیچروں ڈراموں ہلکی پھلکی مزاحیہ تحریروں کی شکل میں بہت کچھ پیش کیا جاتا رہا ہے۔ ان میں سے اکثر کی بنیاد غالب کے اردو خطوط ہیں، جن میں مزاح نگار غالب اول سے آخر تک چھایا ہوا ہے۔ غالب سے چھیڑ چھاڑ کرنے والے اشعار خطوط اور لطائف کے اس سارے مواد کو دلچسپ اور پُرکشش "مضامینِ خیالی ترتیب دینے کے کام میں لائے ہیں اور لڑکوں کے کھیل ہی میں غالب کا تعارف کرا دیا ہے۔ ان مضامین خیالی میں غالب اپنی پوری دلکشی کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اس لحاظ سے ان مضامین کی اپنی یہ افادی حیثیت بھی ہے کہ عام قاری جو تحقیق تنقید اور سوانح کے خشک اوراق سے نہیں گزر سکتا۔ غالب کے بارے میں بہت کچھ جان بھی لیتا ہے۔ اور تازہ دم بھی رہتا ہے۔

زیر نظر کتاب کی ترتیب کا باعث بھی ایسی ہی ایک دلچسپ تحریر ہے ۱۹۵۲ء کے دسمبر کی بات ہے۔ میں نے کراچی سے شایع ہونے والے ایک رسالے کارواں میں ایک تحریر پڑھی جس کا عنوان تھا "غالب کے گھر میں ایک شام" یہ تحریر بہت دلچسپ تھی جی چاہا اسی انداز کی کچھ اور چیزیں بھی پڑھنے کو ملیں۔ رسالے میں لکھنے والے کا نام درج نہیں تھا اور ایڈیٹر نے افسوس کے ساتھ معذرت کی تھی کہ یہ تحریر انھیں جن صاحب سے ملی ہے خود انھیں بھی برسوں پہلے ان کے ایک دوست نے (جو اس دنیا میں نہیں) کسی رسالے سے نقل کر کے بھیجی تھی اور وہ نہ معلوم کیسے مصنف کا نام لکھنا بھول گئے اس لیے مصنف کا نام نہیں دیا جا سکا۔ میرے دل میں یہ خلش رہی کاش مصنف کا نام بھی معلوم ہو جاتا۔

میں ۱۹۵۳ء میں علیگڑھ گیا۔ یونیورسٹی لائبریری کے اُردو سیکشن میں رسائل کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ میں نے وہاں روز کچھ نہ کچھ وقت گزارنا شروع کیا۔ ایک دن نیرنگ خیال لاہور کا ایک پرانا فائل دیکھ رہا تھا کہ میری نظریں ورق الٹتے ہوئے ایک صفحہ پر رک گئیں عنوان

"یہی تھا غالب کے گھر میں ایک شام" اور مصنف کا نام لکھا تھا محمد دین تاثیر۔ اُسی زمانے میں مکتبہ جامعہ کے آرگن کتاب نما میں بھی یہ تحریر کارواں سے نقل ہوئی تھی، میں نے انھیں مصنف کا نام لکھ بھیجا۔ علیگڑھ ہی میں مجھے غالب سے متعلق کئی اور ہلکی پھلکی تحریریں پڑھنے کو ملیں۔ خیال آیا کہ کیوں نہ ان تحریروں کا ایک انتخاب مرتب کر دیا جائے۔ چنانچہ اسی کے نتیجے میں یہ مجموعہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ایک بات کی طرف اشارہ کر دینا مناسب جانتا ہوں پڑھنے والوں کو کہیں کہیں واقعات اور اُن کے برتنے کے انداز میں تکرار معلوم ہوگی۔ یہ توارد ہے اور بقول غالب "توارد عیب نیست" یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ایسا ہونا ناگزیر تھا اس لیے کہ ان سارے لکھنے والوں کے سامنے محدود مواد رہا ہے پھر بھی لکھنے والوں کی نہج انفرادی ہے چونکہ تحریر کا لطف لکھنے والے کے رویے کے ساتھ وابستہ ہے اس لیے تکرار و توارد ناگوار معلوم نہیں ہوتا۔ اگر مرتب کے پیش نظر یہی ایک خیال رہتا کہ صرف وہی تحریریں لی جائیں جن میں تکرار مطالب نہیں ہوئی ہے تو چند بہت ہی مختصر حصوں کی وجہ سے کئی مکمل تحریروں کو نکال دینا پڑتا اور اس طرح بعض دلچسپ عنوانات شریک ہونے سے رہ جاتے۔

ظاہر ہے کہ یہ تحریریں تنقیدی یا تحقیقی مزاج نہیں رکھتیں۔ نہ ان کے لکھنے والوں کا مقصد یہ تھا۔ پھر بھی یہ تحریریں بہت سے رسمی تنقیدی مضامین سے زیادہ بہتر طریقے پر غالب کا تعارف کراتی ہیں اور اُس کے لیے ہمارے دلوں میں محبت کو تازہ کرنے میں رائج الوقت تنقیدوں کے بالمقابل کہیں زیادہ کامیاب ہیں۔ اگر کوئی صاحب نظر کسی ایک آدھ پایۂ تحقیق سے گری ہوئی بات کا سراغ لگالیں یا کسی تاریخی غلطی کا پتہ چلالیں تو اس سے ان تحریروں کی جاذبیت پر کوئی حرف نہیں آتا ــــ مجھے مسرت ہے کہ میں نے ان بکھری ہوئی تحریروں کا ایک انتخاب مرتب کر کے پڑھنے والوں کی خوش اوقاتی میں بہر حال اضافہ کیا ہے۔ میں مصنفین کا شکر گزار ہوں کہ اُن میں سے اکثر نے اپنی نگارشات کو اس ترتیب میں شامل کرنے کی اجازت دی ہے۔ میں نے اپنی حد تک اس مجموعے کے سارے نثر نگاروں سے اجازت حاصل کرنا چاہی تھی۔ تاہم دو تین نام ایسے ضرور رہ گئے جن کے پتے میرے پاس نہ تھے اس لیے اُن تک رسائی میں ناکام رہا۔ ان سے اب اجازت چاہتا ہوں۔

اکبر علی خاں

۲۸ جنوری ۱۹۶۳ء۔ رامپور رضا لائبریری رامپور قلعہ معلی۔

الف

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ

مرزا نوشہ اور چودھویں
غالب کے گھر میں ایک شام
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا
غالب کی محفل
دیوانِ غالب کی طباعت
غالب قید میں
غالب اور نپلین
حیاتِ غالب کے چار منظر
اسد اللہ خاں تمام ہوا

سعادت حسن منٹو

مرزا نوشہ اور چودھویں

[مرزا غالب اپنے دوست حاتم علی مہر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مغل بچے" بھی عجیب ہوتے ہیں کہ جس پر مرتے ہیں، اُس کو مار رکھتے ہیں، میں نے بھی اپنی جوانی میں ایک ستم پیشہ ڈومنی کو مار رکھا تھا۔

سنہ بارہ سو چونسٹھ ہجری میں مرزا غالب چوسر کی بدولت قید ہوئے۔ اس واقعہ کے بارے میں ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں:

"کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں، باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم تھا میرے معاملے میں کوتوال کا ماتحت بن گیا۔ اور میری قید کا حکم سُنا دیا۔"

افسانہ نگار کے لیے یہ چند اشارے مرزا غالب کی رومانی زندگی کا نقشہ تیار کرنے میں کافی مدد دے سکتے ہیں رومان کی پرانی مثلث تو "ستم پیشہ ڈومنی"، اور "کوتوال دشمن تھا" کے مختصر الفاظ ہی مکمل کر دیئے ہیں۔

ستم پیشہ ڈومنی سے مرزا غالب کی ملاقات کیسے ہوئی؟ آیئے ہم تصور کی مدد سے اُس کی تصویر بناتے ہیں]

صبح کا وقت ہے مُرغ اذانیں دے رہے ہیں۔ مرزا نوشہ ہوادار میں بیٹھا ہے جیسے چار کہار لیے جا رہے ہیں، مرزا نوشہ کے بیٹھنے سے پتہ چلتا ہے کہ سخت اُداس ہے، اُداسی کی وجہ یہ ہے کہ اس نے مشاعرے میں اپنی بہترین غزل سنائی مگر حاضرین نے داد نہ دی ایک فقط نواب شیفتہ نے اُس کے کلام کو سراہا اور صدرالدین آزردہ نے اس کا حوصلہ بڑھایا تھا، لیکن بھرے ہوئے مشاعرے میں دو آمیوں کی داد سے کیا ہوتا ہے، مرزا نوشہ کی طبیعت اور بھی زیادہ مکدر ہو گئی تھی جب لوگوں نے ذوق کے کلام کو صرف اس لیے پسند کیا کیونکہ وہ بادشاہ کا اُستاد تھا۔

مشاعرہ جاری تھا مگر مرزا نوشہ اُٹھ کر چلا آیا وہ اور زیادہ کوفت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

مشاعرے سے باہر نکل کر وہ ہوادار میں بیٹھا، کہاروں نے پوچھا "حضور! کیا گھر چلیں گے؟"

مرزا نوشہ نے کہا "نہیں! ہم ابھی کچھ دیر سیر کریں گے۔ ایسے بازاروں سے لے چلو جو سنسان پڑے ہوں"۔

کہار بہت دیر تک مرزا نوشہ کو اٹھائے پھرتے رہے، جس بازار سے بھی گزرتے وہ سنسان تھا، چودھویں کا چاند ڈوبنے کے لیے نیچے جھک گیا تھا۔ اس کی روشنی اُداس ہو گئی تھی۔

ایک بہت ہی سنسان بازار سے ہوادار گزر رہا تھا کہ دور سے سارنگی کی آواز آئی بھیرویں کے سُر تھے تھوڑی دیر کے بعد کسی عورت کے گانے کی تھکی ہوئی آواز سُنائی دی، مرزا نوشہ چونک پڑا اُسی کی غزل کا ایک مطلع بھیرویں کے سُروں پر نبیر رہا تھا:

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

آواز میں درد تھا جوانی تھی لیکن یہ مطلع ختم ہوتے ہی آواز ڈوب گئی ؛ دور ایک کوٹھے پر ملکہ جان جماہیاں لے رہی ہے چاندنی بچھی ہوئی ہے، جس کی سلوٹوں سے اور موتیا اور گلاب کی بکھری اور مسلی ہوئی پتیوں سے پتہ چلتا ہے کہ ناچ کی محفل کو ختم ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے۔

ملکہ جان نے ایک لمبی جماہی لی اور اپنا ضعیف بدن جھٹک کر اپنی سانولی سلونی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی نوچی سے جو گاؤ تکیے پر سر رکھے اپنی گاودم انگلیاں چٹخا رہی تھی کہا، "مومن ہے، شیفتہ ہے، آزردہ ہے، اُستاد شاہ ذوق ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ کل کے اس بتدی شاعر غالب کے کلام میں کیا دھرا ہے کہ جب نہ تب تو اسی کی غزل گائے گی"

نوچی مسکرائی اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی ایک سرد آہ بھر کر اس نے کہا:

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ملکہ جان نے پہلے سے بھی زیادہ لمبی جماہی لی اور کہا، "بھئی اب سو بھی چکو بہت راہ دیکھی جمعدار حشمت خاں کی"

شوخ چشم نوچی نے انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر بازو اوپر لے جا کر ایک جماہی لیتے ہوئے کہا: "بس اب آتے ہی ہوں گے میں نے تو ان سے کہا تھا مرزا غالب کے آگے سے جوں ہی شمع ہٹے وہ ان کی غزل کی نقل لے کر چلے آئیں"

ملکہ جان نے بُرا سا منہ بنایا، "اُس نگوڑے مرزا غالب کے لیے اب

تو اپنی نیند بھی حرام کرے گی۔"

نوچی مسکرائی سامنے فدّن میاں سارنگی پر ٹھوڑی ٹکائے پینک میں اونگھ رہا تھا۔ نوچی نے طنبورہ اٹھایا اور اُس کے تار ہولے ہولے چھیڑنا شروع کیے، پھر اس کے حلق سے خود بخود شعر راگ بن کر نکلنے لگے۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

فدّن میاں ایک دم چونکا آنکھیں مُندی رہیں لیکن سارنگی کے تاروں پر اُس کا گز چلنے لگا۔

میں بُلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل

اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

گانے والی کی تسکین نہ ہوئی چنانچہ اس نے شعر کو یوں گانا شروع کیا:

میں بُلاتی تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل

اُن پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

ملکہ جان ایک دم چونکی اُس نے نوچی کو اشارہ کیا وہ بھی چونک پڑی سامنے دہلیز میں مرزا نوشہ تھا۔ ملکہ جان فوراً اٹھی اور تسلیمات بجائی، نوچی نے بھی اُٹھ کر کھڑے قدم تعظیم دی یہ جان کر کہ شہر کے کوئی رئیس ہیں، ملکہ استقبال کے لیے آگے بڑھی، "آیئے، آیئے، تشریف لائیے، زہے قسمت کہ آپ ایسے رئیس مجھ غریب کو سرفراز فرمائیں آپ کے آنے سے میرا گھر روشن ہوگیا۔"

مرزا نوشہ نے حسن ملیح کے نادر نمونے کی طرف دیکھا، نوچی نے جھک کر کہا: "آیئے ادھر مسند پر تشریف رکھیے۔"

مرزا نوشہ ذرا رُک کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: "تمہارا گلا بہت سُریلا ہے اور تمہاری

آواز میں درد ہے نہ جانے کیوں بے کھٹک اندر چلا آیا۔ کیا تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟
نوچی نے پاس ہی بیٹھتے ہوئے کہا، "جی! مجھے چودھویں کہتے ہیں۔"
مرزا نوشہ مسکرایا "یعنی آج کی رات"
چودھویں مسکرا دی، مرزا نوشہ نے کہا "بھئی خوب گاتی ہو"
چودھویں نے حسب دستور جواب دیا، آپ مجھے بنا رہے ہیں"
مرزا نوشہ کو مذاق سوجھا "بنائی تر کاری سبزی جاتی ہے تم کو تھوڑا ہی بنایا جا سکتا ہے۔"

چودھویں کو کچھ جواب دینا ہی تھا چنانچہ اس نے کہا، "خوب! خوب! یہ بھی خوب! میں بنی بنائی ہوں، اللہ نے مجھے بنایا ہے۔"
مرزا نوشہ نے اسی لہجے میں کہا "اللہ نے سبھی کو بنایا ہے، پر تم بنی ابھی نئی بنی ہو"

چودھویں کے سانولے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس کے چمکیلے دانت موتیوں کی طرح چمکے مرزا نوشہ نے فرمائش کی "ضلع جگت کی چھوڑو اور ذرا پھر وہی غزل گاؤ نہ معلوم کس کی غزل ہے ـــ نکتہ چیں ہے غم دل ـ ہاں ذرا شروع کرو۔

چودھویں کو فرمائش کا یہ انداز پسند نہیں آیا چنانچہ اس نے ذرا تنک کر کہا "یہ غزل غالب کی ہے اور غالب کا سمجھنا کوئی سہل نہیں"
مرزا نوشہ نے پوچھا "کیوں؟"
"سمجھے تو کوئی پختہ کار سمجھے، آپ ایسے نوجوان کیا سمجھیں گے؟"
مرزا نوشہ مسکرایا "بھاؤ بتا کر گاؤ تو کچھ بھاؤ سے انگوں سے شاید سیکھ لوں"
اب چودھویں کو جگت سوجھی، ہلکی سی ناک چڑھا کر کہا، "بھاؤ کا بھاؤ

مہنگا پڑ جائے گا۔"

مرزا نوشہ ایک لمحہ کے لیے خاموش ہو گیا، پھر چودھویں سے مخاطب ہوا
"آپ کو غالب کا کلام بہت پسند ہے۔"

چودھویں نے مسکرا کر جواب دیا۔"جی ہاں!"

ملکہ جان جو ابھی تک خاموش بیٹھی تھی مرزا نوشہ سے مخاطب ہوئی:
"حضور! کئی بار سمجھا چکی ہوں اسے کہ ذوق ہے، مومن ہے، نصیر ہے، شیفتہ ہے سب ملے ہوئے استاد ہیں پر نہ جانے اسے اُس عطائی شاعر غالب میں کیا خاص بات نظر آتی ہے کہ آپ مومن کی فرمائش کریں گے اور یہ غالب شروع کر دے گی۔"

مرزا نوشہ نے مسکرا کر چودھویں کی طرف دیکھا اور کہا "ایسی کوئی خاص بات ہو گی؟"

چودھویں سنجیدہ ہو گئی: "یہ تو وہی جیسے لگی ہو۔"

مرزا نوشہ نے دل چسپی لیتے ہوئے پوچھا "کیا میں سن سکتا ہوں وہ آپ کے دل کی لگی کیا ہے؟"

چودھویں نے سرد آہ بھری "نہ پوچھیے کہاں میں ایک غریب ڈومنی، کہاں غالب! جانے دیجیے اس بات کو کہیے آپ کس کی غزل سنیں گے؟"

مرزا نوشہ مسکرایا "غالب کی، اور کہیے تو میں آپ کو غالب کے پاس لے چلوں، چودھویں کا چاند برج اسد میں طلوع ہو جائے۔"

چودھویں اس کا مطلب نہیں سمجھی، "مجھ ایسی کو وہ کیا پوچھیں گے،
خاک ہو جائیں گے ہم ان کو خبر ہونے تک۔"

مشاعرے میں مرزا نوشہ کو جو کوفت ہوئی تھی اب بالکل دور ہو چکی تھی، اسکے

سامنے سانولے سلونے رنگ کی موٹی موٹی آنکھوں والی ایک لڑکی بیٹھی تھی جس کو اس کے کلام سے بے حد محبت تھی۔ یہ کیوں اور کیسے پیدا ہوئی مرزا نوشہ بہت دیر تک باتیں کرنے کے باوجود بھی نہ جان سکا۔ آخر میں مرزا نوشہ نے اس سے پوچھا، کیا تم نے غالب کو کبھی دیکھا ہے؟"

"نہیں" چودھویں نے جواب دیا۔

مرزا نوشہ نے کہا "میں انھیں جانتا ہوں بہت ہی بگڑے رئیس ہیں تم چاہو تو میں انھیں لا سکتا ہوں یہاں"۔

چودھویں کا چہرہ تمتما اٹھا، "سچ؟"

مرزا نے کہا، "میں کوشش کروں گا" اور یہ کہہ کر جیب سے ایک کاغذ نکالا "میرا کلام سنو گی؟"

چودھویں نے رسمی طور پر کہا "سنائیے ...... ارشاد!"

مرزا نوشہ نے مسکرا کر کاغذ کھولا "یوں تو میں بھی شعر کہتا ہوں پر تمہیں تو غالب کے کلام سے محبت ہے، میرا کلام تمہیں کیا پسند آئے گا"۔

چودھویں نے پھر رسمی طور پر کہا "جی نہیں، کیوں پسند نہ آئے گا، آپ ارشاد فرمائیے"۔

"مرزا نوشہ نے ابھی اس کاغذ کے دو ہی شعر سنائے ہوئے ہوں گے جو اس نے مشاعرے میں پڑھی تھی کہ چودھویں نے ٹوک کر پوچھا، "آپ اس مشاعرے میں شریک تھے جو مفتی صدر الدین آزردہ کے یہاں ہو رہا تھا؟"

مرزا نوشہ نے جواب دیا "جی ہاں"

چودھویں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا "غالب تھے؟"

مرزا نوشہ نے جواب دیا "جی ہاں"

چودھویں نے اور زیادہ اشتیاق سے کہا "کوئی ان کی غزل کا شعر یاد ہو تو سنائیے۔"

مرزا نوشہ نے افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ "اس وقت کوئی یاد نہیں آرہا ہے۔" اس نے اب مذاق کو زیادہ طول نہ دینا چاہا۔ ایک گلوری چودھویں کے ہاتھ کی بنی ہوئی لی، خاصدان میں ایک اشرفی رکھی اور رخصت چاہی۔

کوٹھے سے نیچے اترا تو سیڑھیوں کے پاس مرزا نوشہ کی مٹھ بھیڑ جمعدار حشمت خاں سے ہوئی جو مشاعرے سے واپس آرہا تھا۔ حشمت خاں اس کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

"مرزا نوشہ! آپ یہاں کہاں؟"

مرزا نوشہ خاموش رہا۔ حشمت خاں نے معنی خیز انداز میں کہا "تو یہ کہیے کہ آپ کا بھی اس وادی میں کبھی کبھی گزر ہوتا ہے۔"

مرزا نوشہ نے مختصر سا جواب دیا "فقط آج اور وہ بھی اتفاق سے۔ خدا حافظ" یہ کہہ کر وہ ہوادار میں بیٹھ گیا۔ حشمت خاں اوپر گیا تو چودھویں دیوانہ وار اس کی طرف بڑھی "کہیے غالب کی غزل لائے؟"

حشمت خاں کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے، غزل کا کاغذ جیب سے نکالا اور بڑبڑایا "لایا ہوں ـــــ لو" چودھویں نے بڑے اشتیاق ہاتھوں سے کاغذ لیا تو حشمت خاں نے ذرا لہجے کو سخت کرتے ہوئے کہا "پر غالب تو ابھی ابھی تمہارے کوٹھے سے اتر کر گئے، یہ ماجرا کیا ہے؟"

چودھویں چکرا سی گئی "غالب؟ میرے کوٹھے پر! ابھی ابھی اتر کر گئے! مجھے دیوانہ بنا رہے ہو۔ میرا کوٹھا کہاں ـــــ غالب کہاں؟"

جمعدار نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا "واقعی سچ کہتا ہوں وہ غالب

تھے جو ابھی ابھی تمہارے کوٹھے سے اترے "

چودھویں اور زیادہ چکرا گئی۔ "جھوٹ!"

" نہیں چودھویں سچ کہہ رہا ہوں "

چودھویں نے پاگلوں کی طرح حشمت خاں کو دیکھنا شروع کیا۔

"میری جان کی قسم غالب تھے؟ جھوٹ! مجھ کو بنا رہے ہو۔ اللہ سچ کہو غالب تھے؟"

حشمت خاں بھنّا گیا۔" ارے تمہاری ہی جان کی قسم غالب تھے، مرزا اسداللہ خاں غالب جو مرزا نوشہ کے نام سے مشہور ہیں اور جو اسد بھی تخلّص کرتے ہیں "

چودھویں بھاگی ہوئی کھڑکی کی طرف گئی۔" ہائے میں مرگئی! غالب تھے!" نیچے جھانک کر دیکھا مگر بازار خالی تھا" میرا ستیاناس ہو! میں نے ان کی خاطر مدارات بھی نہ کی "

یہ کہہ کر اس نے غزل کا کاغذ کھول کر دیکھا اور سر پیٹ لیا" اللہ! یہ خواب ہے یا بیداری، سچ ہے۔ تو وہ غالب ہی تھے سو میں غالب ہزار میں غالب تھے۔ جمعدار صاحب! سچ کہا آپ نے وہ ضرور غالب تھے۔ ہائے! میں نے ان سے کہا آپ غالب کے کلام کو کیا سمجھیں گے۔ میں مرجاؤں ـــ بھلا وہ کیا دل میں کہتے ہوں گے۔ ہائے کیسی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔ اُف! نہ معلوم کیا کیا ان سے کہہ گئی؟"

یہ کہتے کہتے اُس نے غزل کا کاغذ منہ پر پھیلا لیا اور رونے لگی۔

محمد دین تاثیر

غالب کے گھر میں ایک شام

تاریخ: شب قدر اور دیوالی کا دن۔ قبل غدر دلی میں، سنہ ۱۸۰۰ء

وقت: مابین عصر و مغرب۔ سایہ ڈھل رہا ہے۔

کردار: ۱۔ میرزا غالب ۲۔ بیگم غالب۔

[ایک مردانہ کمرہ۔ دیواروں پر تازہ سفیدی پھری ہوئی بوسیدہ ایرانی قالین جس پر چیتے کی کھال کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا ہے۔ تین تکیے اِدھر اُدھر پڑے ہوئے ایک پر کلاہِ پپاخ ایک کے پاس جام سفال، ایک پر اوندھی مینائے مے۔ پاس ہی ایک شمع خاموش اور ایک چوسر کی بساط بچھی ہوئی ہے، دائیں طرف باہر کا ایک دروازہ۔ کنڈی لگی ہوئی۔ وسط میں ایک مقفل دروازہ قفل ابجد والا۔ بائیں جانب ایک افسردہ گلخن، آدھی جلی ہوئی لکڑیوں سے بھرا ہوا۔ عین چھت کے قریب جالے سے ڈھنپا ہوا روزن۔]

پردہ اُٹھنے پر میرزا غالب تنہا کھلا ہوا قبا پہنے اِدھر اُدھر ٹہلتے نظر آتے ہیں۔ کچھ گنگنا رہے ہیں کبھی قلم سے کاغذ پر کچھ لکھ دیتے ہیں۔

میرزا غالب: ......ہفت اورنگ۔ اے جہاندارِ آفتاب آثار،.....آفتاب آثار

انقلاب آثار۔ آفتاب کو قافیہ کردوں، بادشاہ کو ایسی ہی زمین پسند آتی ہے۔ ان "لیلائے آشنا" اور "بے بردہ نمک" والی غزلوں پر بہت خوش ہوئے تھے، جبھی وظیفہ مقرر کردیا، مگر یہ کچھ اس بدذوق کا اندازہ ہوجاتا ہے، اور پھر خواہ مخواہ کی دماغ سوزی "آثار" ٹھیک ہے۔ "اذکار" اور "ذگار" دونوں طرح کے قافیے بندھ سکیں گے۔ ہاں تو ع "تھا میں اک دردمند سینہ فگار" ٹھیک!! سے تھا میں اک بلے لولائے گوشہ نشین" اور ع تھا میں افسردہ دل شکستہ..... مگر یہ میرا اپنا مرثیہ نہیں اُن کا قصیدہ ہے، سینہ فگار ہی کافی ہے تو پھر کیا ہوا مجھے؟۔ ع "ہوگئی میری گرمیٔ بازار" ہاں سے "تم نے جو مجھ کو آبرو بخشی ؛ ہوگئی میری گرمیٔ بازار" بڑی!۔ مومن خاں کو فقرہ کسنے کا موقع مل گیا اور تو کچھ نہ ہوا۔ کہتا تھا۔ ع "اب تم وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا" لیکن اس کی تعلیوں سے کیا ہوتا ہے۔ آپ تو رمل فال سے پیسے کما لیتا ہے گو ڈھونگ طبابت کا رچا رکھا ہے۔ خیر مجھے مصرع ہاتھ آگیا۔ مقطع نہیں بنتا تھا نہ جانے یہ مقطع کیوں ضروری ہے۔ مشاعرہ کی غزلوں میں کہنا ہی پڑتا ہے۔ اچھا بھلا ہوگیا تھا سے "غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو ؛ وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں"۔ جیسے مشاعرے ویسی غزلیں عجیب عجیب شعروں پر داد ملتی۔ ع "خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں"۔ ہائے! ع "آخر گنہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں"۔ اس پر بس مومن اور مفتی صاحب (یعنی آزردہ) کو جنبش ہوئی باقی تو وہ خاک بنے رہے۔ یہ بھی ضلع جگت ہوگئی۔ کمبخت درباریوں کی صحبت میرا مذاق بگاڑ رہی ہے قصیدے بھی لکھنے پڑے۔ ابھی تین شعر ہی ہوئے ہیں اور یہ مصرعہ "ہوگئی میری ......" کچھ سست سا ہے قطع کیوں نہ کرڈالوں۔ ع "ہوئی میری وہ گرمی بازار" ٹھیک، ع کہ ہوا مجھ سا ذرہ ناچیز" کیا ہوا؟ ذرہ کو آفتاب بنانا پڑے گا جبھی سمجھیں گے۔ ہاں ع.... مجھ سا ذرہ ناچیز!

کیا ہوگیا؟ ــــ مطلع الانوار ــــ ؟ قافیہ تو خوب ہے۔ ع رو کش مہر مطلع الانوار ــــ ؟ بے معنی معلوم ہوگا انھیں۔ پہلے ہی مہمل گو کہنے لگتے ہیں ...... ع ہے آفتاب ثوابت سیّارہ ؟ نہیں نہیں ع روشناس ِ ثوابت سیّار ، یہ ٹھیک ہے۔ لیکن یہ پھر میرا اپنا تقیدہ ہوجاتا ہے۔ اس کمبخت کو کان بھرنے کا موقع مل جائے گا۔ کیا کروں، ناحق درباری بن گیا۔ اس کے لیے تو باعثِ آبرو تھا یہ عہدہ۔ اُس دن چوٹ سمجھا نہیں۔ ع "بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا" مقطع کام آگیا۔ سب ہنس رہے تھے اور وہ حیران تھا ــــ ہاں ــــ لو ع "بادشاہ کا غلام کار گزار" یہ ٹھیک رہے گا۔ اس میں اپنی کار گزاری بھی آگئی ...... مسلسل کر ڈالوں اسے۔ ایک، دو، تین۔ ٹھیک تینوں بیٹھ گئے ہیں ؛ گرچہ از روئے ننگ بے ہنری ؛؛ ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار ، اگر اپنے کو میں کہوں خاکی ؛؛ جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار۔ شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں ؛؛ بادشہ کا غلام کار گزار۔ بادشاہ سلامت کو معرفت کا بھی دعویٰ ہے۔ بچارا صوفی مزاج ہے۔ اُس دن ع "اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے" پر خاصی داد دی تھی۔ اس دن سے کبھی کبھی غزل میں ایک آدھ تصوف کا شعر جوڑنا ہی پڑ جاتا ہے، پیر و مرشد جو ہوئے۔ ع خانہ زاد اور مرید اور ...... خدا جانے کیا ہے مرید اور نوکر ؟ ــــ نہیں نوکری کا الگ ذکر چاہیے۔ اس مقطع پر کہا گیا تھا کہ ع وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں" میں رعونت پائی جاتی ہے، گویا متاسف ہوں، اور ہوں بھی ــــ ہاں تو ــ خانہ زاد اور مرید اور ...... مدّاح تھا ہمیشہ سے یہ ...... کیا تھا میں پہلے ؟ سوانح نگار تھا مگر یہ لفظ بیٹھتا نہیں تو پھر کیا ہو ؟ ــــ ہاں ــــ "عریضہ نگار" ع "تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار" ـــ ٹھیک ! ــ خانہ زاد اور مرید اور مدّاح ؛؛ تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار" اور ع بارے نوکر بھی ہوگیا ...... صد حیف ! ــ سچ تو یہی ہے مگر ....

(مقفل دروازہ پر زنانہ دستک ہوتی ہے)

کھولتا ہوں۔ کھولتا ہوں، صبر کرو، کیا حرف تھے۔ قفل ابجد لگا ہوا ہے۔ تمہاری ہی پسند ہے، صبر کرو (بڑی مشکل سے حروف جوڑ کر کھولتے ہیں اور بیگم صاحبہ ناک پر رومال رکھے داخل ہوتی ہیں)

بیگم: یہ دروازے بند کرکے کیا کر رہے تھے؟ بارے آج خلوت ہے۔ مینا خالی جو ہے (ناک سے رومال ہٹا کر) مگر بدبو بدستور آ رہی ہے۔ سارا کمرہ متعفن ہے۔

میرزا: کام کر رہا ہوں، اب یہ پرانی بحث از سر نو شروع کرنے سے کیا حاصل، میرے کھانے پینے کے برتن تک تو الگ کر رکھے ہیں تم نے۔

بیگم: تم نے وہ برتن بھی تو بیچ ڈالے، اب مٹی کے آبخوروں پر جام جم کے تصور میں خوش ہو رہے ہو نہ جانے تمہاری خاقہ مستی کیا رنگ لائے گی۔ مگر اچھا ہوا وہ سارا شیطانی کارخانہ بھی ساتھ ہی برباد ہو گیا، شراب سب کو لے ڈوبی۔ آخر تمہیں ایسی بدبودار چیز سے اتنی محبت کیوں ہے؟

میرزا: (مسکرا کر تم جیسی نیکیرن کو بھگانے کے لیے، کہا جو ہے کام کر رہا ہوں، مطلب کی بات کہو۔

بیگم: کام؟ کیوں کام کا نام بدنام کر رہے ہو، کیا کام تھا۔

میرزا: کام کا نام بدنام! — ماشاءاللہ مقفےٰ عبارت بولنے لگی ہو۔ آخر شاعر کی بیوی ٹھیریں۔

بیگم: تم شعر بھی تو کام کے نہیں کہتے۔

میرزا: (بگڑ کر) کیا ہوا میرے شعروں کو؟

بیگم: یہی تو میں پوچھتی ہوں۔ نہ جانے کیا ہوا ہے ان کو۔ آغا عیش کی بیوی کہتی تھی

کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتے۔

میرزا: سمجھ ہو تو آئیں۔ مگر تم اچھی بیوی ہو دشمنوں کی ہاں میں ہاں ملاتی ہو۔

بیگم: سچ بولتی ہوں جھوٹ کی عادت نہیں مجھے، تمہارا ہی کہا گیا ہے۔

میرزا: (مسکرا کر) بارے میرے شعر تو یاد ہونے لگے تمہیں۔ آہستہ آہستہ سمجھنے بھی لگو گی۔

بیگم: تم نے کچھ کچھ میری زبان سیکھنی شروع کی ہے تو سلجھ گئے ہو ورنہ وہ آغائی اُردو کسے یاد ہو سکتی ہے۔ ع ...... ناخن تیشۂ مضراب نہیں۔ نہ جانے کیا تھا، حکیم عیش کی بیوی کچھ سُنا رہی تھی۔

میرزا: (بگڑ کر) کیا بیہودگی ہے۔ میرا شعر کب ہے یہ سب اسی بیگماتی آغا کی تہمت تراشی ہے۔ چاہتے ہیں ہیں بھی زنانی بولی لکھا کروں۔ ہم آبائی سلح بند ٹھیرے (تن کر) ع سو سال سے ہے پیشۂ آبا سپہگری ؛ کچھ ....

بیگم: (بیچ میں بات کاٹ کر) سچ کہتے ہو۔ واقعی یہ تمہاری قسم کی شاعری ذریعہ عزت نہیں ہو سکتی۔ اس میں تم سے وہ حجام کا لڑکا ہی اچھا رہا خاقانیٔ ہند، ملک الشعراء، نہ جانے کیا کیا کچھ کہلایا۔ کاش تم بزرگوں کی طرح سلح بند ہی رہتے۔ یہ شعر گوئی کیوں شروع کی۔ بزرگوں کا نام ڈبونا ہی تھا تو کوئی اور کام کرتے، جس سے کچھ آمد ہوتی۔

میرزا: کام تو کر رہا تھا۔ تم یونہیں تضیع اوقات کر رہی ہو۔

بیگم: خاک کام کر رہے تھے۔ کیا کام تھا جو تالے چڑھا کر یوں جتے ہوئے تھے۔

میرزا: اب تمہیں تو جب تک کوئی گھاس کھودتا نظر نہ آئے، کام معلوم نہیں ہوتا قصیدہ لکھ رہا ہوں۔ بادشاہ سلامت کا اور آج رات دربار میں حاضری ہے سُنانا ہے۔

بیگم: گھاس کھود سکتے تو یوں در و دیوار پر سبزہ تو نہ اُگ رہا ہوتا، گھر صحرا معلوم ہوتا ہے۔ اتنا سبزہ ہے کہ بازار میں بیچنے سے رات کی روٹی کا سامان آجاتا۔ اسی لیے آئی تھی۔ نہ لکڑی ہے نہ کوئلہ، آرام کے اسباب تو کیا سامان خورد و نوش بھی نہیں، مہینے بھر سے روز کہتی ہوں ختم ہو گیا مگر تم ہر بار مذاق میں ٹال دیتے ہو۔

میرزا: مہینہ بھر سے روز کہتی ہو اور ختم آج ہوا ہے۔ تم عورتوں کی کسی بات کا اعتبار کیا ہو۔ اور پھر میں کیا کروں ماما کو پیسے دو، منگوالو۔

بیگم: پیسے دو، منگوالو! پیسے کہاں سے دوں؟ ع چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟ مردوں کی چھ ماہی کی طرح تنخواہ ملتی ہے نہیں۔ ایک تہائی ساہوکار کے نذر ہو جاتی ہے کچھ شراب و کباب میں اُڑا ڈالتے ہو۔ جائداد پہلے ہی سے رہن ہے، خدا جانے تم شراب کیوں پیتے ہو، خدا اور رسول کا خیال نہیں تو جیب ہی کا فکر ہوتا۔ شراب کی محبت ہے تو اگلے جہاں میں محرومی کے خوف ہی سے تو رک جاؤ۔

میرزا: وہاں ملتی رہیگی، فکر نہ کرو۔ تمہیں عادت نہیں ہے، تم اپنا خیال کرو۔ اچھو بچھو آئیں گے، ہمارا کیا ہے، ساقیٔ کوثر کی بخشش پر سہارا ہے، اور یہاں تو تمہارے رونے کو برداشت کرنے اور بھلانے کی خاطر پیتا ہوں۔ کل بیمار تھا۔ اکیلا پڑا سڑا کیا، تمہیں اتنی توفیق نہ ہوئی کہ پوچھ لیتیں، شراب نہ پیوں تو اور کیا کروں۔

بیگم: بیمار؟ زیادہ پی لی تھی اور کیا اور پھر تم نے خود ہی تو کہہ رکھا ہے۔ ع "پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار"، میں نے تمہارا کہا کر دیکھا۔

میرزا: ساتھ ع "ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زبان کوئی نہ ہو" کی شرط بھی تو تھی۔ اس

روز کی چڑ چڑ سے تنگ آکر لکھا تھا. بھلا اس تو تو میں میں میں کیا کام ہو سکے، اور روپیہ کہاں سے آئے۔

بیگم: تو کیا روپیہ کمانے کا کام کر رہے تھے؟ کیا تھا وہ کام؟

میرزا: قصیدہ لکھ رہا تھا بادشاہ سلامت کا۔

بیگم: تم روپیہ کمانے کا ذکر کر رہے تھے، ان قصیدوں میں کیا رکھا ہے، پہلے لکھ کر کیا ملا! سڑی ہوئی مونگ کی دال! اکڑی ہوئی بیسنی روٹی، سیم کے بیج! جواب دعوے باندھ رہے ہو۔ یہی غنیمت ہے سال میں چند ٹھیکریاں مل جاتی ہیں جیسا کام ویسے دام۔ خدا جانے یہ سلسلہ بھی کس طرح قائم ہے۔ تمہارے شعر بھی تو اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

میرزا: دیکھو، مذاق کی حد ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں نماز پر کچھ ہنسی مذاق میں کہا تھا تو تم میکے چلے جانے کی دھمکیاں دینے لگی تھیں۔ میرے شعروں کے متعلق یہ اندازِ گفتگو جاری رکھا تو پھر میں بھی کھوٹے ہتھیاروں پر اُتر آؤں گا۔

بیگم: لیکن نماز تو فرمودۂ خدا ہے تمہارے شعروں سے کیا نسبت؟

میرزا: میرے شعر بھی تو نوائے سروش ہیں غیب سے مضامین آتے ہیں ؎

غالب اگر ایں فن سخن دین بودے ؛ آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے۔

بیگم: ٹھیک۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ غیب ہی سے مضامین آتے ہوں گے جو معنی یوں غائب رہتے ہیں اور زبان تو واقعی اوپر والی ہے۔ اس زمین پر بسنے والے تو نہیں بولتے، کم از کم دلّی میں تو نہیں بولتے ہیں۔

میرزا: دِلّی دِلّی! دِلّی کو میں کیا جانتا ہوں؟ خود اُردو کی کیا حیثیت ہے؟ میرے معانی آنے والی نسلیں سمجھیں گی۔

بیگم: صحیح ہوگا۔ مگر دلّی تو آج چاہیے۔ آنے والی نسلیں خدا جانے کب آئیں

قصیدہ تو بہادر شاہ دِلّی کے بادشاہ کو سُنانا ہے۔

میرزا: اور ایسا لکھ رہا ہوں کہ بادشاہ سُن کر پھڑ جائے۔ سنو کیسے پُرزور اشعار ہیں ؎

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ اے جہاندارِ آفتاب آثار
تھا......

بیگم: (ٹوک کر) یہ پہلا شعر ہے کیا؟ مطلع کہاں ہے؟

میرزا: مطلع مقطع کیا ہوتا ہے، تم شعر سنو۔
اے شہنشاہ......

تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی ہوئی میری وہ گرمئ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز روشناسِ ثوابت و سیّار
گرچہ از روئے ننگ بے ہنری ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں اپنے جی میں کہ ہوں بادشہ کا غلام کارگذار
خانہ زاد اور مرید اور مدّاح تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

بیگم: اس میں آدھی فارسی ہے اور کام کی بات ندارد۔ یہ داستان ماضی ہے، آج کی حالت بیان کرو۔ مگر تمہیں سیدھا صاف لکھنا ہی نہیں آتا۔ میں یہ تھا اور میں وہ تھا، اب کیا ہو یہ کہو۔ لیکن اب وقت کم ہے اور ایسی مشکل زبان میں لکھنا کوہ کندن کے برابر ہے۔

میرزا: کوہ کندن کیا۔ لکھنا کیوں نہیں آتا۔ میں کیا ہوں، یہ لکھوں۔ لو ابھی لو۔ دفی البدیہہ

کہنے لگتے ہیں):

آج مجھ سا نہیں زمانے میں | شاعر نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستان گر سُنیے | ہے زباں میری تیغ جوہردار
بزم کا التزام گر کیجے | ہے قلم میرا ابر گوہر بار

بیگم: (ٹوک کر) یہ اپنا قصیدہ کہہ رہے ہو کہ بادشاہ کا مطلب کی بات کہو صاف صاف کہو تنخواہ ماہوار چاہیے، اور سردیاں آ رہی ہیں، کپڑے نہیں ہیں، آخر تم درباری ہو، تمہاری بے آبروئی دربار کی بے آبروئی ہے۔ قرضہ بڑھ رہا ہے۔

میرزا: تو یہ بھٹ گری ہوئی۔

بیگم: تو قصیدہ اور کیا ہوتا ہے۔ میری مانو سیدھی سیدھی باتیں لکھو، مگر وہی آغا علیش کی بیوی کی بات، تم اس طرح لکھ ہی نہیں سکتے۔

میرزا: لکھ نہیں سکتا؟ یوں واہیات بکنا کیا مشکل ہے۔ سُن لو:

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں | مدعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں | ذوقِ آرائش سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر | تا نہ دے بادِ زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش | جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال | کچھ بنایا نہیں ہے اب کے بار
آگ تاپے کہاں تلک انسان | دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی | وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

بیگم: (بیچ میں) بات ہوئی نا؟ اور وہ قرض اور تنخواہ کا معاملہ؟

میرزا: (کان سے قلم اتار کر پھر لکھنے لگتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ پڑھتے جاتے ہیں):

میری تنخواہ جو مقرر ہے
اوس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا
ہوگیا ہے شریک ساہوکار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
میری تنخواہ کیجیے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

بیگم: بات ہوئی نا؟ جب تم یوں لکھ سکتے ہو تو پھر ہمیشہ اسی طرح کیوں نہیں لکھتے دیکھ لینا داد بھی خوب ملے گی اور بادشاہ سلامت کو حقیقت حال بھی معلوم ہو جائے گی۔

میرزا: خیر داد تو جو ملے گی، معلوم۔ البتہ قصیدہ گیا۔ چھتیس کے قریب اشعار ہو گئے ہیں، ایک دو دعائیہ راستہ میں لگا دوں گا۔ ترتیب بھی بدل دونگا مکمل کام ہو گیا۔ چلو تمہارا کہا بھی کر دیکھتا ہوں۔

[اتنے میں مغرب کی اذان سنائی دیتی ہے، بیگم نماز کے لیے زنانہ میں چلی جاتی ہیں اور غالب کپڑے بدلنے لگتے ہیں۔ کلاہ پیاخ کا ترچھا زاویہ بنا رہے تھے کہ بیگم لوٹ آتی ہیں۔]

بیگم: کھانا ابھی کھاؤ گے یا واپس لوٹ کر۔

میرزا: کھانا؟ کہاں سے آگیا؟ اور تم اتنی جلدی کیسے لوٹ آئیں؟ نماز تو خدا کے دربار میں حضوری ہوتی ہے مگر تم کر دو بھی گیا۔ آخر تمہیں نمازوں سے کیا حاصل جنت میں ہم جائیں تو ہمیں حوریں ملیں گی، تمہیں کیا ملے گا؟

کوئی مسجد کا ملاّ، نیلا تہمد، کھدّر کا کرتہ، کاندھے پر رومالی، رومال میں حجرے کی کنجی، سر پہ پگڑ۔ اور ہم ...... جناب دائیں طرف ......

بیگم: (بگڑ کر) دیکھیے یہ تمسخر اب چھوڑیئے، میں کہہ چکی ہوں خدا اور رسول کے احکام پہ پھبتیاں نہ کہا کرو، یہ اُسی کا وبال ہے کہ میرے بچے زندہ نہیں رہتے۔ عارف کو پالا تھا وہ بھی .... (بیگم کی آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں۔ غالب بھی نمناک ہو جاتے ہیں، اتنے میں باہر سے کہاروں کی آواز آتی ہے "پینیس حاضر"!)

بیگم: نواب خیر سے سوار ہو جایئے اور کوئی اچھی خبر لایئے

میرزا: (زیر لب) ع "بے مایہ چو یائی کہ مرا زندہی" کہتے ہوئے باہر چلے جاتے ہیں، بیگم زنانے میں لوٹ آتی ہیں۔

آل احمد سرور

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

راوی: یادگارِ غالب میں حالی لکھتے ہیں:
"مرنے سے کئی برس پہلے چلنا پھرنا موقوف ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی۔" ۱۸۶۶ء میں خواجہ عزیز لکھنوی لکھنؤ سے کشمیر جاتے وقت راستے میں غالب سے ملے تھے، مرزا صاحب کے پختہ مکان میں ایک بڑا پھاٹک تھا جس کی بغل میں ایک کمرہ اور کمرے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر ایک نحیف الجثہ آدمی، گندمی رنگ، اسّی بیاسی سال کے ضعیف، لیٹے ہوئے، ایک مجلّد کتاب سینے پر رکھے، آنکھیں گڑوئے ہوئے پڑھ رہے تھے۔ یہ غالب تھے، جو دیوانِ قاآنی ملاحظہ فرما رہے تھے۔

خواجہ عزیز: آداب بجا لاتا ہوں (زور سے) آداب بجا لاتا ہوں (وقفہ)

غالب: تشریف رکھیے۔ بندہ پرور۔ یہ قلمدان اور کاغذ ہے۔ آنکھوں سے کسی قدر سوجھتا بھی ہے لیکن کانوں سے بالکل سنائی نہیں دیتا۔ جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب لکھ دو۔ کہاں سے آئے ہو کیا نام ہے۔ (وقفہ)

عزیزؔ لکھنوی ۔ مجھ سے ملنے آئے ہو تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہو گے ۔ کچھ اپنا کلام بھی سناؤ ۔

عزیز : ہم تو آپ کا کلام آپکی زبان مبارک سے سننے کی غرض سے آئے تھے ۔

غالب : بھئی کچھ تو سناؤ ۔

عزیز : ایک مطلع یاد آیا ہے ۔ وہ عرض کیے دیتا ہوں محض تعمیل ارشاد ہے ؎

مرا مصراست داغ ۔ از رشک مہتابے کہ من دارم
زلیخا کور شد از حسرت خوابے کہ من دارم

غالب : سبحان اللہ ! کیا مزے کا مطلع کہا ہے ۔ بھائی تم تو خوب کہتے ہو (شعر دہراتے ہیں)

عزیز : اب آپ بھی کچھ ارشاد فرمائیے ۔ مدت سے آرزو تھی کہ آپ کا کلام آپکی زبان سے سنیں ۔

غالب : کیا سناؤں میرا حال دیکھ ہی رہے ہو ۔ ایک غزل کے چند شعر یاد آگئے وہی سنائے دیتا ہوں ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اسکی گردن پر
وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دم بدم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

عزیز: حضور آپ نے بڑا سرفراز کیا۔ گستاخی ہوتی ہے مگر ابھی سیری نہیں ہوئی۔

غالب: بھائی اب میں تھک گیا۔ ایک شعر اور سن لو۔ آجکل اکثر پڑھتا رہتا ہوں۔

زندگی اپنی جو اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالب: (باآواز بلند) کھانا لاؤ۔

عزیز: حضور تکلیف نہ کیجیے۔ ہم صرف تھوڑی دیر کے لیے اتر پڑے تھے۔ ریل کا وقت بالکل قریب ہے بگھی سرائے میں کھڑی ہے۔ اسباب بندھا ہوا رکھا ہے۔ آپ سے ملنے کو آئے تھے اب اجازت چاہتے ہیں۔

غالب: آپکی غایت اس تکلیف سے یہ تھی کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں، ضعف کی حالت دیکھی کہ اٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔ بصارت کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچانتا تک نہیں ہوں۔ سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا ہی چیخے خبر نہیں ہوتی۔ غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا۔ کلام سنا۔ اب ایک بات رہ گئی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں۔ اس کو بھی ملاحظہ

کرنے جائیے۔ صبح کو سات بادام کا شیرہ۔ قند کے شربت کے ساتھ۔ دوپہر کو مٹکے بھر گوشت کا گاڑھا پانی۔ کبھی دو چار پھلکے قریب شام تین تلے ہوئے کباب۔ کچھ گھڑی رات گئے پانچ روپے بھر شراب۔ زندگی عذاب ہو گئی ہے۔ ہائے میرا ایک شعر ہے:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

(پھر ٹھہر ٹھہر کر گنگناتے ہیں)

راوی: غالب آگرے میں رونق افروز ہیں۔ دیوان سنگھ راجہ کے یہاں غالب کے اعزاز میں ایک مخصوص غیر طرحی مشاعرہ ہے۔ انعام الدین ساحر، احمد شیون، زین العابدین شورش، غلام غوث بے خبر شریک ہیں۔ غالب باتیں کر رہے ہیں۔

غالب: بھئی ہم کو ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے نصیحت کی تھی کہ زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم تانع فسق و فجور ہیں۔ پیو۔ کھاؤ۔ مزے اڑاؤ۔ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے ہیں جب بہشت کا تصوّر کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصوّر سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشم بددور، وہی ایک حور۔

بے خبر: حضور ذرا اس حور کو بھی دیکھیے۔

غالب: کون؟

بے خبر: یہ درگا بائی صنم ہیں۔ واہ کیا سج دھج ہے۔ قشقے کی آب و تاب اور سبز دوشالے کی آن بان تو دیکھیے۔
صنم: آداب بجالاتی ہوں۔ آپ کا عرصہ سے شہرہ سنا تھا، آج زیارت ہوئی۔
غالب: واہ ؎ سیہ چوٹی، زر افشاں مانگ، سبز اس پر دوشالہ ہے
تماشا ہے پر طاؤس ہیں کالے کو پالا ہے
صنم: آپ کی ذرہ نوازی ہے۔
غالب: آپ ذرہ نہیں آفتاب ہیں۔ ہاں صاحب اب مشاعرہ شروع ہو۔ صنم صاحبہ آپ ہی شروع کیجیے۔
صنم: عرض کرتی ہوں:

کچھ دوائے دل وجگر نہ ہوئی — مر گئے تم انھیں خبر نہ ہوئی
دل و جاں ہجر میں گئے ایسے — ایک کو ایک کی خبر نہ ہوئی
رہیں اب دیر ہی میں چل کے صنم — اپنی کعبے میں تو بسر نہ ہوئی

غالب: سبحان اللہ۔ شاعرہ اور شعر کا دونوں کا جواب نہیں۔ خیر اب چند شعر میرے بھی سن لیجیے؎

ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھکو زباں اور
ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور
مرتا ہوں ہر اک وار پہ ہر چند سر اُڑ جائے

جلاّد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

بے خبر: سچ ہے۔ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

(ہلکی موسیقی)

راوی: مفتی صدرالدین خاں آزردہ کی عدالت ہے۔ غالبؔ کا مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ الزام یہ ہے کہ انھوں نے شراب قرض لی اور دام نہ دے سکے۔

مفتی صدرالدین آزردہ: کہیے مرزا صاحب آپ کو اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے استغاثہ کے گواہوں کے بیانات بالکل واضح ہیں۔

غالب: پیر و مرشد مجھے کچھ عرض کرنا نہیں۔ میرا ایک شعر ہے۔ اس وقت یاد آیا۔ وہ سنائے دیتا ہوں ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صاحب: مرزا صاحب کیا شعر کہا ہے۔ آپ جیسے شاعر بے بدل کے لیے عدالت میں اس طرح کھنچا کھنچا پھرنا آپ کی توہین ہے آپ تشریف لے جائیے جرمانے کی رقم میں اپنے پاس سے ادا کیے دیتا ہوں۔

درباری کے ہلکے ہلکے سر آہستہ آہستہ بلند ہو جاتے ہیں۔

نقیب: نگاہ روبرو۔ اعلیٰ حضرت خطاب فرماتے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر: اب مرزا نوشہ کی باری ہے۔ مرزا صاحب اپنی غزل سنائیے۔ مگر ریختہ ہو فارسی نہیں۔

غالب: پیر و مرشد ؎

فارسی بیں تا بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

ظفر : ما بدولت تو اُردو میں شعر کہتے ہیں اور اسی زبان کا شعر پسند کرتے ہیں

غالب : عرض کرتا ہوں ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا | اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا
ترے وعدہ پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا | کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو | یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے | غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا | جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا
یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ | تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

: سبحان اللہ۔ سبحان اللہ

ظفر : بھئی ہم تو تب بھی ولی نہ سمجھتے۔

غالب : پیر و مرشد۔ تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ اس لیے ارشاد ہوا کہ میں اپنی ولایت پر کہیں مغرور نہ ہو جاؤں۔

ظفر : (ہلکا قہقہہ) مرزا نوشہ خدا تمہیں زندہ رکھے۔ بڑے ہی دل چسپ آدمی ہو اور بھئی پڑھتے تو خوب ہو۔

راوی : ۹ بجے صبح کا عمل ہے غالب کھانا کھانے اندر جاتے ہیں۔ چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں۔ ایک طوطا سردی کی وجہ سے سمٹا سمٹایا پروں میں چونچ دبائے بیٹھا ہے۔

غالب : میاں مٹھو نہ تمہارے جورو نہ بچے تم کس فکر میں سر جھکائے بیٹھے ہو۔

امراؤ بیگم : میں کہتی ہوں یہ تمہیں سوجھ کیا گیا ہے۔ اور کچھ نہ ملا تو اس طوطے کے پیچھے

پڑ گئے۔

غالب: تو کیا جھوٹ کہتا ہوں۔ میرا ایک فارسی کا قطعہ ہے ؎

بہ آدم زن بہ شیطان طوقِ لعنت　　سپردند از رہِ تکریم و تذلیل

ولیکن در اسیری طوقِ آدم　　گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

امراؤ: ہاں ہاں تم تو مجھے طوقِ لعنت سمجھتے ہو۔ میں تو روز خدا سے دعا مانگتی ہوں کہ مجھ گناہگار کو اس دنیا سے اٹھالے۔ یا تمہاری اصلاح کر دے۔ بوڑھے ہونے کو آئے۔ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہو۔ مگر یہ موئی شراب ایسی منہ سے لگی ہے کہ چھوٹتی ہی نہیں۔

غالب: تمہیں کیا۔ تم نے تو اپنے کھانے پینے کے برتن الگ کر ہی لیے۔

امراؤ: (تیز ہو کر) کیوں نہ کرتی۔ ہاں خوب یاد آیا۔ تم نے مجھے اُس مکان کی محلسرا دیکھنے کو بھیجا تھا۔ ابھی دیکھ کر آئی ہوں۔ تم کہتے تھے دیوان خانہ بہت اچھا ہے۔ محل سرا بھی بری نہیں، میرا کیا ہے میں تو کرائے کے مکان میں رہنے کی عادی ہو چکی ہوں۔ مگر میں نے سنا ہے اس مکان میں کوئی بلا ہے۔

غالب: کیا دنیا میں آپ سے بڑھ کر بھی کوئی بلا ہے۔

امراؤ: یہی تو تمہاری باتیں مجھے پسند نہیں۔ پھر چھیڑ خانی پر اتر آئے۔

غالب: میں ہوں منہ سوڑ اور تو ہے مقطّع ہمیرا تیرا میل نہیں۔

امراؤ: سنا ہے شہر میں وبا پھیل گئی ہے۔ ہیضے سے برابر موتیں ہو رہی ہیں۔ تم تو باہر دوست احباب میں دل بہلاتے رہتے ہو۔ میں گھر میں پڑی دہلا کرتی ہوں۔

غالب: کیسی وبا۔ جب ایک ستّر برس کے بڈھے اور ستر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکے تو تف ہے اس وبا پر۔ اچھا اب میں باہر جاتا ہوں۔ تمہارے وظیفے

کو دیر ہوئی ہوگی۔

(موسیقی)

راوی: شیفتہ کے مکان پر مہمان جمع ہیں مفتی صدرالدین آزردہ، مولوی فضل حق، مصطفٰے خاں شیفتہ، اردو دیوانِ غالب کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

آزردہ: مرزا صاحب بیدل کا رنگ آپ نے خود ہی ترک کر دیا ہے۔ انتخاب میں ایسے اشعار سب نکال دیجیے۔

غالب: کیوں بھئی مصطفٰے خاں تمہاری کیا رائے ہے۔ بھئی تم تو جانتے ہو تمہاری رائے پر مجھے کتنا اعتماد ہے۔

شیفتہ: پیر و مرشد یہ آپکی محبت ہے کہ میری ناچیز رائے کو اس قدر وقعت دیتے ہیں۔ آپ خود ہی فیصلہ کیجیے کہ آپ کے رنگ میں پہلے سے تبدیلی ہوئی ہے کہ نہیں۔

غالب: کیوں نہیں، میری طبیعت اگرچہ ابتدا سے نادر خیالات کی جویا تھی لیکن آزادہ روی کے سبب سے زیادہ تر ان لوگوں کی تقلید کرتا رہا جو سیدھے راستے سے ہٹ گئے تھے۔ آخر جب ان لوگوں نے جو اس راہ میں پیش رو تھے دیکھا کہ میں باوجود اس کے کہ ان کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بھی بے راہ بھٹکتا پھرتا ہوں، تو ان کو میرے حال پر رحم آیا اور انھوں نے مجھ پر مربیانہ نظر ڈالی۔ شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی۔ طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ پھرنے کا جو مادہ مجھ میں تھا اس کو فنا کر دیا۔ ظہوری نے میرے بازو پر تعویذ اور کمر پر زادِ راہ باندھا اور نظیری نے اپنی روشِ خاص پر چلنا مجھے سکھایا۔ اب میں نے وہ رنگ اختیار کیا ہے کہ فارسی کو بھی ریختے پر رشک آئے۔

آزردہ : مگر مرزا صاحب یہ سچی بات تو ہے کہ آپ بہت عرصے تک بھٹکتے رہے ہیں اور اب بھی سیدھی راہ پر نہیں آئے ہیں۔

شیفتہ : مرزا صاحب کا یہ شعر آپ نے سنا ہے ؎

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا　　لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

آزردہ : واہ کیا شعر ہے۔ یہ شاعری نہیں اعجاز ہے۔ مگر مرزا صاحب یہ تو آپ کا رنگ نہیں، خاص ہماری طرز کا شعر ہے۔

غالب : نوائے کہ محوِ سخن گستران پیشینی　　مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

فضل حق : مرزا صاحب آزردہ کی رائے صحیح ہے۔ آپ کو یاد نہیں جب آپ اکبر آباد سے آئے تھے تو یہاں کے مشاعروں میں آپ کی مشکل پسندی پر کس قدر طنز و تعریض ہوتی تھی۔ ملا عبدالقادر رامپوری نے تو ایک بے معنی شعر آپ سے منسوب ہی کر دیا تھا۔ اگر آپ چاہیں تو نمونے کے طور پر چند شعر بیدل کے رنگ کے رہنے دیں۔ ورنہ اردو دیوان میں تو آپ کو موجودہ رنگ میں زیادہ جلوہ گر ہونا چاہیے۔

غالب : اچھا بھائی تم اور شیفتہ مل کر میرے ریختے کا انتخاب کر دو۔ پھر میں اسے ایک نظر دیکھ لوں گا۔ اور اس کے بعد دیوان چھاپے خانے کو دے دیا جائے گا۔ تم دونوں کی نکتہ سنجی اور ذوقِ سخن کا میں قائل ہوں۔

فضل حق : ابھی نواب صاحب نے آپ کا جو شعر سنایا تھا اس غزل کے اور شعر یاد ہوں تو سنائیے۔ اس زمین میں مومن اور ذوق کی بھی مشہور غزلیں ہیں۔

غالب : میرا بھی دو غزلہ ہے۔ مگر بھائی اب حافظہ کمزور ہو گیا ہے چند ہی شعر یاد ہیں وہ سن لو ؎

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں　　کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں — میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے — جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

فضل : کیا کہنے ہیں مرزا صاحب دریا کو کوزے میں بند کرنا یہی ہے۔

راوی : غروبِ آفتاب کے وقت غالب کھانا کھا رہے ہیں۔ حالی کے ساتھ دوسرے شاگرد بھی موجود ہیں، حالی رومال سے مکھیاں جھل رہے ہیں۔

غالب : آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں۔ میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ بھی نہ دوں گا۔ (ہنس کر) بھئی آپ نے نواب عبداللہ خاں کا قصہ سنا ہے۔ ان کے دسترخوان پر سب کے لیے ہر قسم کے کھانے ہوتے تھے۔ مگر خاص ان کے لیے ہمیشہ ایک ہی چیز تیار ہوتی تھی۔ ایک دن مزعفر اُن کے سامنے آیا۔ مصاحبوں میں سے ایک ڈوم بہت منہ لگا ہوا تھا۔ نواب صاحب نے اس کو کھانا دینے کے لیے خالی رکابی مانگی جس کے آنے میں کچھ دیر ہوئی۔ نواب کھاتے جاتے تھے اور خالی رکابی بار بار مانگتے تھے۔ مصاحب نواب کے آگے رومال ہلانے لگا اور کہا "حضور اور رکابی کیا کیجیے گا۔ اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے۔" نواب یہ فقرہ سن کر پھڑک گئے اور وہی رکابی اس کی طرف سرکا دی۔ (تھکے ہوئے لہجے میں) لو بھئی اب میں ذرا آرام کرنا چاہتا ہوں، پیری کی تیس ہوش اُڑائے دیتی ہے (کراہ کر) تم لوگ میرے قریب آجاؤ باتیں کرنے سے طبیعت بہلی رہے گی۔

مجروح : لائیے میں آپ کے پاؤں دبادوں۔
غالب ، بھئی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گنہ گار کرتا ہے
مجروح : ایسا ہی ہے تو مجھے کچھ اجرت دیدیجئے گا۔
غالب : اچھا یہی سہی۔
حالی : واہ کیا خوشگوار ہوا ہے۔ آسمان کو دیکھیے کیا نکھرا ہوا ہے۔
غالب : جو کام خود رائی سے کیا جاتا ہے اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ ستاروں کو دیکھیے کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں نہ تناسب ہے نہ انتظام۔ نہ بیل ہے نہ بوٹا۔ مگر بادشاہ خود مختار ہے کوئی دم نہیں مار سکتا۔ (ہلکا قہقہہ)
حالی : آپ کا ایک شعر میری سمجھ میں نہیں آیا۔
غالب : تو کیا تعجب ہے۔ میری زندگی بھی تو تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ اچھا وہ کیا شعر ہے۔
حالی : تمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ ؛ اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے
غالب : ارے بھائی اے کی جگہ جُز پڑھو معنی خود سمجھ میں آجائیں گے۔
حالی : اگر آپ اے کی جگہ جُز کا لفظ رکھ دیتے یا دوسرا مصرع اس طرح کہتے کہ "اے نالہ نشاں تیرے سوا عشق کا کیا ہے" تو کیا حرج تھا۔
غالب : تم ٹھیک کہتے ہو۔ مطلب تو واضح ہو جاتا مگر میری انفرادیت کا خون ہو جاتا۔ میں شارع عام پر چلنے سے بچتا ہوں۔ میں نے ایک دفعہ اپنے مرنے کی تاریخ کہی تھی۔ غالب مرد۔ اسی سال شہر میں وبا پھیلی۔ سال گزرنے پر کسی نے کہا کہ حضرت آپ نے تو اپنے مرنے کی تاریخ بھی کہہ لی تھی۔ پھر یہ کیا ہوا۔ میں نے اسے لکھا کہ لسان الغیب کی بات غلط نہیں ہو سکتی، مگر وبائے عام میں مرنا میری شان کے خلاف تھا۔ میں طرز خیال میں جدت اور

طرفگی دیکھتا ہوں۔ شاعری کو معنی آفرینی سمجھتا ہوں قافیہ پیمائی نہیں۔ میں ایسی رعایتوں کو جو ہر شخص کو سوجھ جائیں مبتذل جانتا ہوں۔ ایک شخص نے ایک دفعہ ایک شعر کی میرے سامنے بہت تعریف کی۔ میں نے پوچھا کہ ارشاد تو ہو وہ کونسا شعر ہے اس نے میر امانی اسد کا یہ شعر سنایا ؎

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

مجھے اس پر بہت غصہ آیا۔ بے ساختہ زبان سے نکلا کہ حضرت اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اس پر رحمت خدا کی اور اگر مجھ اسد کا شعر ہے تو مجھ پر لعنت خدا کی۔ میرے شیر اور رحمت خدا کی۔ ایسے محاورے جو عامیوں اور سوفیوں کی زبان پر جاری ہیں میرے شعر کی شریعت میں حرام ہیں میں نوجہاں صلِ علیٰ بھی اپنے کسی شاگرد کے یہاں لکھا دیکھتا ہوں اسے نام خدا کر دیتا ہوں۔ مدح و ستایش کی مجھے پروا نہیں تحسین نا شناس کا میں قایل نہیں ؎

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا ۔۔۔ گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی

اچھا بھئی میر مہدی اب تم بس کرو۔ تھک گئے ہوگے۔

مجروح: حضور میرے پیر دابنے کی اجرت۔

غالب: بھیا کیسی اجرت۔ تم نے میرے پاؤں دابے۔ میں نے تمہارے پیسے دابے۔ حساب برابر ہوا۔ (قہقہہ)

راوی: ۱۸۶۰ء۔ غدر کا ہنگامہ فرو ہو چکا ہے، مگر دہلی پر ہر سو ویرانی چھائی ہوئی ہے۔ لوگ پریشان ہیں۔ جان و مال، آبرو کچھ محفوظ نہیں۔ غالب نے میر مہدی مجروح کو خط لکھا ہے مجروح اپنے احباب کو پڑھ کر سنا رہے ہیں۔

مجروح: بھائی کیا پوچھتے ہو۔ کیا لکھوں۔ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔
قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی۔
ہر سال میلا پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں۔
پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا مسجد جامع سے راجگھاٹ
دروازہ تک بلا مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں
وہ اگر اٹھ جائیں تو ایک ہو کا عالم ہو جائے۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا اب جو
کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا۔ تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائیگا۔
اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہتے ہیں واہ رے حسن
اعتقاد۔ بندۂ خدا۔ اردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں۔ دلی کہاں۔ واللہ اب
شہر نہیں ہے۔ کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر۔ نہ بازار۔ نہ نہر۔

مجروح: ہائے کیا تھا کیا ہو گیا۔

حالی: تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ نہ سنا جائیگا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
غالب کا آخری زمانہ ہے ضعف بہت بڑھ گیا ہے۔ اکثر پلنگ پر لیٹے لیٹے
گذرتی ہے۔ اس وقت منشی ہرگوپال تفتہ آئے ہوئے ہیں ان سے باتیں
ہو رہی ہیں۔

غالب: میں تو بنی آدم کو مسلمان ہو یا ہندو، یا نصرانی۔ عزیز رکھتا ہوں اور اپنا
بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی وہ عزیز داری جس کو
اہل دنیا قرابت داری کہتے ہیں۔ اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریقت
شرط ہے اور اس کے مراتب و مدارج ہیں۔ دنیا دار نہیں ہوں، فقیر خاکسار
ہوں۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ
میں بھر دیئے ہیں بقدر ہزار ایک بھی ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی

کہ لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ٹین کا لوٹا ۔سوت کی رسی لٹکاوں اور پیادہ چل دوں ۔کبھی شیراز جا نکلا ۔ کبھی مصر میں جا ٹھیرا ۔کبھی نجف جا پہنچا نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں ۔اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو ننگا بھوکا نظر نہ آئے ۔

شیفتہ : حضور وہ میری غزل پر اب تک اصلاح نہ ہوئی ۔ میں چاہتا تھا کہ تیسرا دیوان جلد مرتب کر لیتا ۔

غالب : مرزا تفتہ تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں ۔ بو علی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضایع اور بے فائدہ اور موہوم سمجھتا ہوں زیست بسر کرنے کو تھوڑی سی راحت درکار ہے ۔ باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب بیکار ہے ۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا ۔ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گم نام رہے تو کیا ۔کچھ معاش ہو کچھ صحت جسمانی ، باقی سب وہم ہے اے یار جانی ۔ اچھا بھائی اب میں تھک گیا ۔

راوی : غالب بستر مرگ پر ہیں ۔بڑی دیر کے بعد ہوش آیا ہے حالی اور دوسرے احباب پاس بیٹھے ہیں ۔ غالب علائی کے خط کا جواب لکھوا رہے ہیں ۔

(نحیف آواز میں اور ٹھیر ٹھیر کر) جان غالب ۔تم میرا حال کیا پوچھتے ہو ۔ دو چار دن میں ہمسایوں سے پوچھنا ۔ ہائے ۔ ہائے ۔

دم واپسیں بر سر راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے ۔

(حزینہ موسیقی آہستہ آہستہ کم ہوتی جاتی ہے)

سیّد عابد علی عابد

غالبؔ کی محفل

(مقام دہلی ۱۸۵۶ء عیسوی)

راوی: ۱۸۵۰ء تک دہلی اور لکھنؤ کی محفلوں پر بہار تھی، ہر طرف شعر و سخن کا چرچا تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی طور پر آزاد کے الفاظ میں درختِ اقبال کو دیمک لگ چکی تھی۔ لیکن ابھی برگ و بار کی شگفتگی اور تازگی کو دیکھتے ہوئے گمان تک نہ ہوتا تھا۔ کہ یہ درخت گرا چاہتا ہے۔ دہلی میں مومنؔ، ذوقؔ غالبؔ شیفتہؔ، سالکؔ، مجروحؔ اور آزردہؔ اپنی رنگین توانائیوں سے پابندِ وضع سامعین کو مسحور کر رہے تھے۔ ادھر لکھنؤ میں ۱۸۴۷ء کے بعد رنگیلے پیا جانِ عالم نے دربار سجایا تھا۔ اور ایسا رنگ جمایا تھا کہ لوگ اِندر کے اکھاڑے کو بھول گئے تھے۔

۱۸۵۰ء کے بعد، شاطر فلک نے اس بساطِ ادب کے مُہروں کو ایک ایک کر کے چننا شروع کیا۔ ۱۸۵۱ء میں مومنؔ سدھارے، ۱۸۵۴ء میں ذوقؔ نے اس دنیا سے منہ موڑا۔ ۱۸۵۶ء میں رنگیلے پیا جان عالم معزول ہوئے۔ اور مٹیا برج بھیج دیئے گئے۔ کچھ پروانے اس بجھی ہوئی شمع کا طواف کرنے

کے لیے وہاں بھی جا پہنچے۔ لیکن سچ پوچھیے تو محفل سونی ہو گئی۔
تو فرض کر لیجیے کہ ۱۸۵۶ء عیسوی ہے اگرچہ بجھ چکی ہے لیکن خاکستر میں کچھ چنگاریاں باقی ہیں۔ بساط اٹھائی جا رہی ہے۔ لیکن ابھی شعر و سخن کے کچھ متوالے آنکھیں بند کیے حال مست محفل میں بیٹھے ہیں۔ یہ حالت ہے کہ ہم آپ کو دہلی قاسم جان کی گلی میں لیے چلتے ہیں، جہاں اسد اللہ خاں غالب المعروف بہ مرزا نوشہ حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہتے ہیں۔

(قدموں کی چاپ)

شیفتہ : (بلند آواز سے) کلّو۔
کلّو : (دور سے) جی سرکار۔
شیفتہ : کیوں بھئی مرزا نوشہ تشریف رکھتے ہیں؟
کلّو : جی حضور۔ دیوان خانہ میں لیٹے ہیں۔ میر مہدی مجروح بھی وہیں بیٹھے ہیں،

(وقفہ)

تشریف لے آیئے۔ آیئے نواب صاحب تشریف لایئے۔ خواجہ صاحب۔

(چاپ)

شیفتہ : حضور! تسلیمات عرض کرتا ہوں۔
حالی : آداب بجا لاتا ہوں۔
غالب : آہا۔ نواب مصطفٰے خاں۔ اور خواجہ الطاف حسین حالی بھی ساتھ تشریف لائے ہیں۔
شیفتہ : حضور۔ خواجہ الطاف حسین تو ضرور تشریف لائے ہیں لیکن نواب مصطفٰے خاں کہاں ہیں؟
غالب : (ہنس کر) ایں۔ میر مہدی۔ سنا تم نے۔ ارے بھئی میری بینائی میں اتنا فتور آ گیا

ذرا دیکھنا یہ نواب مصطفےٰ خاں نہیں ہیں۔

مہدی مجروح: حضور یہ تو نواب مصطفےٰ خاں ہی۔

شیفتہ: (ہنسکر) کون، نواب مصطفےٰ خاں! واہ میر مہدی یہ کیا بات ہوئی۔

غالب: (ہنسکر) ارے بھئی تو آخر تم پھر کون ہو جو اس طرح بے باکانہ مجھ خاک نشیں کے گھر گھسے چلے آتے ہو۔

شیفتہ: (ہنسکر) حضور میں تو آپ کا شیفتہ ہوں۔

غالب: اخاہ۔ یہ بات ہے۔ سنا میر مہدی۔ اچھا بھئی شیفتہ خدا تمہیں جزائے خیر دے کہ ایک ساٹھ برس کے بوڑھے پر شیفتہ ہو۔

حالی: حضور ہی کا شعر ہے۔ ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

غالب: (ہنس کر) واہ بھئی حالی واہ (وقفہ) ادھر آؤ نا شیفتہ میرے پاس۔

شیفتہ: آج حضور میرے ہاں مشاعرے میں تشریف نہیں لائے۔

غالب: اے میر مہدی بولتے کیوں نہیں۔

(وقفہ)

ارے بھئی شیفتہ اس سیدزادے کی فرمائشوں سے ناک میں دم ہے۔

شیفتہ: حضور کیا بات ہوئی؟

غالب: جواب دو نا میر مہدی، اب چپ کیوں سادھ لی۔

مجروح: نواب صاحب قبلہ ہوا یہ کہ میرے ملنے والوں میں سے ایک صاحب کا لڑکا بے چارا ناگہاں مر گیا۔ وہ میرے سر ہو گئے کہ میرزا نوشہ سے تاریخ کہلوا دو خوشی کی تقریب کی فرمائش ہوتی تو میں ٹال بھی جاتا۔ بات ایسی تھی کہ کچھ کہہ

بھی نہ سکتا تھا۔ آخر انھیں لے کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان صاحب کو وطن واپس جانے کی جلدی تھی۔ ضد کرنے لگے کہ ابھی تاریخ کہہ دیں اسی میں الجھے رہے (وقفہ) اور پھر کچھ طبیعت بھی حضور کی ناساز تھی۔

حالی: خیر باشد۔

غالب: بھئی پرسوں سے پنڈلیوں میں اور پاؤں میں درد ہے۔

مجروح: میں تو کہہ رہا ہوں کہ حضور پاؤں داب دوں۔ آپ مانتے ہی نہیں،

غالب: اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی، تو سید زادہ ہو کر میرے پاؤں دابے گا کیوں مجھے گنہگار کرتا ہے۔

مجروح: تو آپ اُجرت دے دیجیے گا نا۔ آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ لیجیے ذرا پاؤں پھیلائیے۔

غالب: اے میر مہدی تو مانے گا تھوڑا ہی اچھا جو تیرے جی میں آئے کر۔ (وقفہ) ہاں بھئی شیفتہ، مشاعرہ کیسا رہا۔

شیفتہ: آپ کے بغیر مشاعرے میں کیا خاک لطف آتا۔

غالب: شیفتہ، سچ پوچھو تو اب مشاعروں میں غزل پڑھنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ مشاعروں کی رونق تو ذوق مرحوم اور مومن مرحوم کے دم سے تھی ہلئے مومن کی جامہ زیبی اور بانکپن یاد آتا ہے۔ تو کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ اور ذوق مرحوم کی زبان کا لطف ہی نہیں بھولتا۔

شیفتہ: یہ تو آپ نے درست ارشاد فرمایا۔ حکیم مومن خاں کی موت نے محفلوں کو سونا کر دیا۔

مجروح: (ہنس کر) حضور آپ نے سنا۔ نواب صاحب نے کیا ارشاد فرمایا۔

غالب: (ہنس کر) ہاں میر مہدی سنا! تم بھی خوب سمجھے۔ کیوں شیفتہ۔ حکیم مومن خاں

کی موت نے تو محفلوں کو سونا کر دیا۔ اور ذوق مرحوم کا ذکر ہی نہیں۔

شیفتہ: (ہنسکر) میرا یہ مطلب ہی نہیں تھا۔

غالب: خیر تم کچھ ہی کہو شیفتہ۔ بعض شعر تو ذوق نے ایسے کہے ہیں کہ آدمی پہروں سر دُھنا کرے۔ (زانو پہ ہاتھ مار کے) ہائے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مجروح: سبحان اللہ! کیا شعر کہا ہے۔ اور حضور نے پڑھا بھی کیا خوب ہے۔

غالب: اور سنو ؎

اس روئے تابناک پہ ہر قطرہ عرق
گویا کہ اک ستارہ ہے صبحِ بہار کا

ہائے ہائے کیا اچھوتی تشبیہ ہے۔ ستارہ ہے صبح بہار کا۔

شیفتہ: اچھا شعر ہے۔

غالب: شکر ہے تم نے ذوق مرحوم کے کسی شعر کو اچھا تو کہا۔ (وقفہ)
ہاں بھئی مشاعرے والی بات تو وہیں کی وہیں رہ گئی۔ مصرع طرح کیا تھا
ہاں یاد آگیا۔

ع رنج اور رنج بھی تنہائی کا

ہاں تو پھر کس کی غزل حاصل مشاعرہ رہی۔

شیفتہ: غزلیں کچھ کمزور تھیں۔ (ہنسکر) ورنہ کچھ شعر مجھے ضرور یاد رہ جاتے۔

(وقفہ)

نواب مرزا داغ کا ایک مطلع خوب تھا۔

مجروح: ہاں نواب ارشاد فرمایئے نا۔ کیا مطلع تھا۔

شیفتہ: مطلع تھا ۔

جلوہ دیکھا تری رعنائی کا — کیا کلیجہ ہے تماشائی کا

مجروح: سبحان اللہ ۔ سبحان اللہ ۔ کیا کلیجہ ہے تماشائی کا ۔

غالب: خوب کہا ۔ دیکھنا شیفتہ شاگرد کے ہاں استاد سے بھی زیادہ تیکھا پن اور گھلاوٹ ہے ۔ ذوق کا نام روشن کر دیا داغ نے ۔

شیفتہ: جی اس میں کیا شک ہے ۔ لیکن سچ پوچھیے ۔ تو ہمارے خواجہ الطاف حسین حالی کی غزل سب سے اچھی تھی ۔

غالب: (تعجب سے) ہاں بہت خوب ۔ حالی، تم نے غزل پڑھی تھی ۔

حالی: جی نہیں ۔

شیفتہ: حضور بات یہ ہے کہ غزل انھوں نے کہی تھی پڑھی نہیں ۔ میں سمجھا کر تھک رہا ۔ مانے ہی نہیں ۔ اور کیا عرض کروں ۔ کیا غزل لکھی ہے ۔

غالب: بھئی حالی! میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ تم شعر نہ کہو گے تو طبیعت پر بڑا ظلم کرو گے ۔ اب شیفتہ نے بھی قریب قریب وہی بات دوسرے پیرائے میں بیان کی ۔ ان کی بات تو شعر کے معاملے میں باون تولے پاؤ رتی سچ ہوا کرتی ہے (ہنس کر) میری بات سن کر تم نے دل میں کہا ہو گا کہ بوڑھا سٹھیا گیا ہے ۔ اب کیا کہتے ہو ۔

حالی: حضور یہ کیا ارشاد فرماتے ہیں ۔

غالب: بھئی آخر پھر تم نے غزل کہی تو پڑھی کیوں نہیں ۔

حالی: حضور . . . .

شیفتہ: میں عرض کرتا ہوں ۔ کہ کہتے ہیں کہ حضور اصلاح دیں تو غزل پڑھتا ہوں

مجروح: اور کہتے بھی ٹھیک ہیں ۔

شیفتہ : تو اور کیا۔
غالب: (ہنسکر) تو یوں کہو کہ کھچڑی پکا کر آئے ہو تم اور حالی ۔ (وقفہ)
بھئی حالی سنو! بات یہ ہے کہ شعر کہنے کا جوہر فطری اور طبیعی ہوتا ہے جسے یہ نعمت مبدائے فیاض کی طرف سے عطا ہوتی ہے اس کا سونا مشق سے خود بخود کسوٹی پر چڑھتا چلا جاتا ہے ۔ باقی رہا اصلاح کا معاملہ ۔ تو بھئی میں نے کسی سے اصلاح نہیں لی ۔ میں تمہیں کیا اصلاح دوں گا۔
شیفتہ : خیر، آج تو حضور، خواجہ صاحب اصلاح لیے بغیر نہ مانیں گے ۔
مجروح : نواب صاحب قبلہ ۔ اب حضور اصلاح دینے سے بہت اجتناب کرنے لگے ہیں ۔ آپ اصرار فرمائیں تو بات بنے گی، پچھلے دنوں ایک صاحب کا خط آیا کہ اب آپ میرے اشعار پر اصلاح کیوں نہیں دیتے آپ نے بہ سبب ذوق سخن کے اشعار کی اصلاح منظور فرمائی تھی، اب کیا بات واقع ہوئی کہ آپ توجہ نہیں فرماتے ۔ اب حضور ہی سے پوچھیے کہ حضور نے کیا جواب لکھا۔
شیفتہ : کیا لکھا حضور نے جواب میں ۔
غالب : (ہنسکر) جل کر لکھا تھا ۔ کہ لاحول ولا قوۃ کس ملعون نے بسبب ذوق شعر کے اصلاح اشعار منظور کی تھی ۔ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار ۔ میں نے تو بہ طریق قہر درویش بجان درویش لکھا تھا کہ جیسے اچھی جورو مرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا قبول کرتی ہے میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے ۔
(تینوں مل کر ہنستے ہیں)
مجروح : اب آپ ہی فرمایئے نواب صاحب کہ اصلاح کے لیے کوئی غزل کیا پیش

کرے۔

غالب : ارے بھئی ہٹاؤ بھی اب یہ قصہ ۔ ہاں حالی سناؤ اپنی غزل۔

شیفتہ (ہنسکر) ہائے کیا غزل کہی ہے۔ حالی نے حضور تقصیر معاف ہو۔ بھئی حالی اگر حضور اصلاح دینے کا وعدہ نہ فرمائیں تو غزل نہ سنانا۔

حالی : بہت خوب پیر و مرشد۔

شیفتہ : (ہنس کر) خوب غزل لکھی ہے حالی نے۔

(میر مہدی اور حالی مل کر ہنستے ہیں)

غالب : تم تینوں جیتے اور میں ہارا۔ مجھ بوڑھے میں اب دم کہاں ہے کہ تم تینوں کا مقابلہ کروں۔ ہاں صاحب غزل سنوں گا اور جھک مار کے اصلاح بھی دوں گا۔ (تینوں ہنستے ہیں) لو اب سناؤ غزل حالی۔

حالی : مصرع طرح پر گرہ لگا کے مطلع بنا دیا ہے۔ ؎

رنج اور رنج بھی تنہائی کا　　وقت پہنچا مری رسوائی کا

مجروح : واہ وا ماشاء اللہ۔ کیا گرہ لگائی ہے۔

حالی : تسلیمات۔ (وقفہ)

عمر شاید نہ کرے آج وفا　　سامنا ہے شب تنہائی کا

غالب : ہائے کیا شعر کہا ہے حالی "عمر شاید نہ کرے آج وفا" اور دوسرا مصرع یوں پڑھو : "کاٹنا ہے شب تنہائی کا"

شیفتہ : آہاہا۔ کیا برجستہ اصلاح دی ہے۔ حضور نے کیا موزوں لفظ رکھا ہے "کاٹنا"۔

حالی : اپنے شعر کا صحیح مطلب بھی میری سمجھ میں اصلاح کے بعد ہی آیا ہے۔

غالب : ہاں حالی پڑھو۔

حالی: کچھ تو ہے قدر تماشائی کی ہے جو یہ شوق خود آرائی کا
یہی انجام تھا اے فصلِ خزاں گل و بلبل کی شناسائی کا

مجروح: بہت خوب، بہت خوب!!

حالی: تسلیم۔
غیر کے گھر بھی نہ جی سے اترا پوچھنا کیا تری رعنائی کا

غالب: واہ۔ کیا رعنائی کا ثبوت دیا ہے۔ پہلے مصرعہ کو یوں پڑھو:
بزمِ دشمن میں نہ جی سے اترا پوچھنا کیا تری رعنائی کا

شیفتہ: خوب اصلاح دی حضور نے غیر کا لفظ کچھ کمزور تھا۔ دشمن کے لفظ نے شعر میں جان ڈال دی۔ اور پھر بزمِ دشمن اب ان کی رعنائی میں کس کا فرکو شک ہوگا۔ کہ دشمن کی بھری محفل میں خود محفلِ نظارہ بنے بیٹھے ہیں اور حالی کے جی سے نہیں اترتے۔

حالی: تسلیم۔ مقطع عرض کرتا ہوں ؎
ہوں گے حالی سے بہت آوارہ دور ہے گھر ابھی رسوائی کا

مجروح: اہا۔ ہا۔ کیا مقطع ہے۔ کیا تمنا ہے۔ درِ رسوائی تک پہنچنے کی۔

غالب: خوب غزل کہی تم نے حالی۔

حالی: سب آپ ہی کا فیض ہے۔

غالب: اے میر مہدی مجھے زیادہ گنہگار نہ کر، اب تو میرے پاؤں نہ داب۔

مجروح: بہت اچھا حضور، تو لائیے میری اجرت دلوائیے۔

غالب: (ہنس کر) واہ۔ اجرت کیسی تم نے میرے پاؤں دابے۔ میں نے تمہاری اجرت دابی۔ حساب برابر ہوا، اب اجرت کا سوال کہاں ہے۔
(تینوں ہنستے ہیں)

غالب : کیوں بھئی شیفتہ میرے دیوان کی طباعت کا انتظام ہو رہا ہے نا۔
شیفتہ : جی ہاں ایک مطبع سے بات چیت شروع کی ہے۔ تصحیح میں خود کروں گا۔
غالب : تصحیح تو خیر ہو جائے گی۔ تم نے اشعار کا انتخاب بھی کیا ہے یا نہیں۔
شیفتہ : یہ حضور کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ حضور کا کلام تو سراپا انتخاب ہے۔ ہاں آپ کے ارشاد کے مطابق ان اشعار پر نشان لگا رہا ہوں جو خاص طور پر مجھے پسند ہیں۔
غالب : سنا میر مہدی اور سن رہے ہو حالی۔ ہمارا کلام سراپا انتخاب ہے (ہنس کر) بھئی شیفتہ۔ اگر تمہارے خلوص پر اعتماد نہ ہوتا۔ تو میں سمجھتا کہ تم مجھے بنا تے ہو۔
شیفتہ : یہ کیا فرماتے ہیں آپ۔
غالب : سنو حالی۔ اکیس برس کی عمر میں میں نے ایک اچھا خاصا دیوان مرتب کر لیا تھا۔ اور اس کے بعد اس میں کچھ اور رطب دیا بس ملا کے ایک نسخہ بھوپال بھیج دیا تھا اب جو ان پرانی غزلوں کو پڑھتا ہوں تو خود ہنسی آتی ہے سب مضامین خیالی بے ہودہ جگر کاوی۔ بات یہ ہے کہ شروع میں بیدل کے کلام پر مرمٹا تھا۔ بڑی جگر کاوی اور عرق ریزی سے مضمون تلاش کرتا تھا اور ایسی دور کی کوڑی لاتا تھا۔ کہ کبھی شعر کا مطلب آدھا، اور کبھی پورا خبط ہو جاتا تھا۔ اور ہمارے نواب مصطفےٰ خاں کہتے ہیں کہ آپ کا کلام سراپا انتخاب ہے اب تمہیں بتاؤ کہ ہمارے اس بذلہ سنجی کا کیا جواب ہے۔
(حالی اور میر مہدی ہنستے ہیں)
شیفتہ : حضور کے رنگ قدیم کے شعر بھی اچھے ہیں۔
غالب : اچھے تو کیا ہیں۔ ہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ شاعر پرانے ڈھرے پر نہیں چلتا۔

(وقفہ) بیدل کے تتبع نے جہاں مجھے نقصان پہنچایا ہے وہاں فائدہ بھی خاصہ ہوا ہے۔ پیش پا افتادہ مضامین سے گریز، پامال خیالات سے اجتناب مضمون کی جستجو میں جگر کاوی۔ الفاظ کی نشست میں عرق ریزی۔ بیدل ہی کا فیضان ہے۔ اختراع تراکیب فارسی کا گر، اور استعارات و تشبیہات کی طرفگی کا سبق میں نے بیدل ہی سے سیکھا ہے۔

شیفتہ: حضور کی بعض تشبیہات اور استعارات تو لاجواب ہیں۔ سنو حالی۔

خوں در جگر نہفتہ بہ زردی رسیدہ ہوں — خود آشیانِ طائرِ رنگ پریدہ ہوں
دوران سر سے گردشِ ساغر ہے متصل — خمخانۂ جنوں میں دماغ رسیدہ ہوں
میں چشم وا کشادہ و گلشن نظر فریب — لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں
سر پر مرے وبالِ ہزار آرزو رہا — یارب میں کس غریب کا بختِ رمیدہ ہوں
ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج — میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ — ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

حالی: سبحان اللہ۔ ایک سے ایک بڑھ کر تشبیہ ہے۔ ساری غزل مرصع ہے۔

مجروح: ایسی ترکیبیں اور ایسے تشبیہات و استعارات کہ ایک دریائے معانی کو مختصر سے لفظوں کے کوزے میں بند کر دیں اور کہاں ملیں گی۔

غالب: (ہنس کر) عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو! تم تو کیوں بیان کرو گے۔ مجھ سے خود اپنے ابتدائی دور کی بیہودگیاں سنو۔ دیکھو یہ شعر بھی میرے ہی ہیں۔

جنوں گرم انتظار و نالہ بےتابی کمند آیا — سویدا تا بہ لب زنجیر سے دودِ سپند آیا
مہ و اختر فشاں کی بہرِ استقبال آنکھوں سے — تماشا کشورِ آئینہ میں آئینہ بند آیا
عدم ہے خیر خواہِ جلوہ کو زندانِ بیتابی — خرامِ نازِ برقِ خرمنِ سعیٔ پسند آیا

(ہنس کر) کیوں جی ہمارا کلام سراپا انتخاب ہے نا۔؟
(تینوں ہنستے ہیں، (قدموں کی چاپ)

کلّو: حضور بیگم صاحبہ! زنان خانے میں تشریف لے جانا چاہتی ہیں۔ مکان دیکھ کر واپس تشریف لائی ہیں۔

غالب: اچھا لیجیے۔ آپ سب صاحب ذرا اس ساتھ والے کمرے میں ہو جائیں
(قدموں کی چاپ۔ وقفہ)
(قدموں کی چاپ۔ غالب قہقہہ لگاتا ہے)

غالب: بھئی لطیفہ ہو گیا۔ اس وقت تو (پھر ہنستا ہے)

شیفتہ: ارشاد۔ ارشاد۔

غالب: بھئی بات یہ ہے کہ برسات میں اس مکان میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ خدا کا قہر ہے۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برستی ہے۔ آخر بیگم نے تقاضا کیا کہ مکان بدلو۔ میں مری۔ میں دلی! آج نیا مکان دیکھنے گئی تھیں اب جو واپس آئیں۔ تو میں نے پوچھا کہ مکان پسند آیا تو فرمایا کہ مکان تو اچھا ہے۔ لیکن لوگ اس میں بلا بتاتے ہیں یہ سن کر میں نے کہا کہ دنیا میں آپ سے بڑھ کر بھی کوئی بلا ہے!
(چار رنل ہنستے ہیں)

غالب: ہاں بھئی حالی اگر بیدل کا رنگ مجھ پر چھایا رہتا۔ تو اُردو میں طرز بیدل نہ نبھتی۔ بس یوں سمجھ لو کہ بیہودہ گو ہو کر رہ جاتا وہ تو یوں کہو کہ مبدائے فیاض نے مجھے گمراہ نہ ہونے دیا۔ میر کی سادگی نے چشم نمائی کی سہل ممتنع کلام نے مجھے متنبہ کیا۔ رفتہ رفتہ میں سیدھے ڈھرّے پر آ گیا۔ شیفتہ کی صحبت نے میرے جوہر کو اور بھی چمکا دیا۔ اب دیکھ لو غزل کا کیا رنگ ہے۔

شیفتہ: یہ تو حضور کی ذرّہ نوازی ہے۔ (ہنس کر) پرسوں لطیفہ ہوا میرے مکان پر احباب جمع تھے۔ کہ کوئی صاحب ہیں افسوس تخلص فرماتے ہیں، وہ تشریف لے آئے۔ آپ کا ذکر آگیا۔ تو انھوں نے آپ کی غزل امید بر نہیں آتی، نظر نہیں آتی کے کچھ شعر پڑھے۔ اور پھر جب یہ شعر پڑھا، آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی"، تو فرمایا کہ اس شعر میں کیا بات ہے۔ پامال مضمون ہے۔ اور طرز ادا میں بھی کوئی جدّت نہیں تعجب ہے۔ کہ مرزا نوشہ نے ایسا شعر کہا میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ شعر ان کا ہے ہی نہیں۔

غالب: (ہنس کر) سخن فہمی عالم بالا معلوم شد، پھر۔

شیفتہ: میں نے متانت سے کہا کہ قبلہ۔ شعر تو یہ مرزا نوشہ ہی کا ہے لیکن معاف کیجیے گا۔ آپ شعر کا حلیہ بگاڑ کے اس طرح پڑھتے ہیں کہ مرزا نوشہ کا شعر نہیں رہتا۔

غالب: بہت خوب۔

شیفتہ: پھر میں نے شعر پڑھ کے سنا دیا اور مزے کی بات یہ ہے کہ شعر کا مطلب پھر بھی نہ سمجھے۔ پھر جو احباب نے کھول کے مطلب سمجھایا تو بہت جھینپے اور فوراً اٹھ کر چل دیئے۔

مجروح: ذرا پڑھیے گا تو شعر نواب صاحب قبلہ! کس طرح شعر پڑھنے سے مطلب صاف ہونا چاہیے۔

شیفتہ: سنیے: آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی؛ اب کسی بات پر نہیں آتی" (بات پر زور دے کر پڑھا جائے)

حالی: واہ۔ نواب صاحب کیا پہلو بدلا ہے شعر کے مضمون نے! مطلب یہ ہوا ناکہ دیوانگی کا سا عالم تو پہلے بھی تھا کہ اپنے دل کے حال پر خود ہی ہنس

لیا کرتے تھے۔ یہاں تک تو خیریت لیکن اب تو یہ عالم ہے۔ کہ ہنسی کسی بات پر نہیں آتی۔ بے وجہ بھی ہنس دیتے ہیں۔

مجروح: واہ۔ خواجہ صاحب آپ نے خوب مطلب سمجھا شعر کا۔

(دور سے ایک مردانہ آواز۔ جس میں رس اور سوز ہے۔ سنائی دیتی ہے، یہ گاتی ہوئی "مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے" آواز قریب آتی جاتی ہے۔)

غالب: ذرا سننا شیفتہ۔

شیفتہ: جی سن رہا ہوں۔

غالب: یہ ایک درویش صفت آدمی ہے۔ جسے میرے بہت سے شعر یاد ہیں۔ پچھلے دنوں اس نے میری غزل گا کر سنائی تھی ع دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے۔

شیفتہ: تو دیوان خانے میں بلالیں۔

غالب: نہیں آئے گا۔ اور لطف یہ ہے کہ کچھ لیتا بھی نہیں۔ پچھلی بار میں نے کچھ دینا چاہا تو خفا ہو گیا۔ بس چپ چاپ بیٹھے سنا کرو۔ غزل گائے گا اور چلا جائے گا۔

(اب آواز صاف آتی ہے اور یہ غزل گائی جاتی ہے)

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے	جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا	جاں نذرِ دلفریبیٔ عنواں کیے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس	زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو	سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ	چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن	بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے ۔ بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

(آخری شعر کے ساتھ آواز دور ہوتی چلی جاتی ہے،
غزل کے گانے کے دوران میں شیفتہ، مجروح اور حالی
موقع بہ موقع داد دیتے ہیں۔)

شیفتہ: کیا مرصع غزل ہے یہ حضور کی۔ ہر شعر لاجواب ہے (ہنس کر)
"ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد" والا معاملہ ہے۔

غالب: تم بھی کیا باتیں لے بیٹھے شیفتہ، بڑھاپے میں ہمیں یہ تذکرے ناپسند ہیں۔

(وقفہ)

لو میں ابھی آیا۔

(قدموں کی چاپ)

شیفتہ: (سرگوشی میں لیکن اس طرح کہ آواز صاف سنائی دے) میر مہدی یہ غزل سن کر میرزا نوشہ کی نظروں میں اگلے وقتوں کی تصویر پھر گئی۔ اس واقعہ کی کسک اب تک ان کے دل سے گئی نہیں۔

مجروح: (اسی طرح سرگوشی میں کہ آواز صاف سنائی دے) آپ کی مراد ہے کہ یہ اسی کا ذکر ہے، جس نے (آواز صاف سنائی نہیں دیتی صرف کھسر پسر کی آواز آتی ہے)

شیفتہ: (سرگوشی میں) ارے ایک قتالۂ عالم تھی وہ! آفت کا ٹکڑا۔ ہائے ہائے وہ حسن وہ راگداری اور پھر مرزا نوشہ نے۔

(آواز سنائی نہیں دیتی، کھسر پھسر کی آواز آتی ہے)

مجروح: اس کے مرنے کا بڑا صدمہ ہوا تھا ان کو۔ میں دیکھتا تھا......

(آواز سنائی نہیں دیتی)

شیفتہ: اور اس کا مرثیہ بھی کیسا دردناک لکھا ہے، میرزا نوشہ نے،

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے
گوش مہجورِ پیام و چشم محروم جمال
ایک دل تِس پہ یہ ناامیدواری ہائے ہائے

مجروح: اور مقطع تو ملاحظہ ہو۔

گر مصیبت تھی تو غربت میں اُٹھا لیتے اسدؔ
میری دلّی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

شیفتہ: (ہنس کر) جو دیوان چھپنے کے لیے جارہا ہے۔ اس میں مقطع کو یوں بدل دیا ہے:

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی الفت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

(قدموں کی چاپ)

غالب: ہاں بھئی شیفتہ۔

کلّو: حضور مطبع ثمر ہند سے، ایک آدمی آیا ہے۔ کہتا ہے دیوانِ سخن دہلوی پر جو کچھ آپ کو لکھنا تھا وہ لکھ لیا ہو تو عنایت فرما دیجیے۔

غالب: بھئی اس سے کہہ دو کہ شام تک وہ کاغذ پہنچ جائے گا۔

کلّو: بہتر حضور۔

شیفتہ: سخن دہلوی اپنا کلام چھپوا رہے ہیں۔ اور آپ تقریظ لکھ رہے ہیں۔

غالب: ہاں بھئی شیفتہ، میں نے تو بہتیرا اسے سمجھایا کہ بھائی مجھ سے تقریظ نہ لکھواؤ۔ ایک تو میں جو کچھ لکھ کے دیتا ہوں۔ لوگ اس سے خوش نہیں ہوتے، دوسرے میری تقریظ اور تعریف، کسی کو راس نہیں آتی۔ لیکن وہ

مانتا ہی نہیں ۔

شیفتہ : جی ہاں لوگ یہ شکایت تو کرتے ہیں کہ آپ مصنف کی ستایش میں مضائقہ کرتے ہیں اور تقریظ میں ادھر ادھر کی باتیں لکھ کر ٹال دیتے ہیں ۔

غالب : سچ ہے شیفتہ ، کہ مجھے ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی روش نہیں آتی ، کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دوں ، میرے قصیدے اٹھا کر دیکھ لو ، تشبیب کے شعر بیشتر ، اور مدح کے کمتر پاؤ گے !

مجروح : تو حضور نے اس تقریظ میں کیا لکھا ہے ۔

غالب : کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہیں ، تعریف میں تو یہ دو فقرے ہیں کہ "اس سحر کار جادو نگار نے پریزادانِ معانی کو الفاظ کے شیشوں میں اس طرح اتارا ہے ، جیسے آبگینہ مے سے رنگ مے نظر آئے ۔ لفظ سے جلوۂ معنی آشکار ہے ! چشم بدور آغاز جوانی اور نو بہار باغ زندگانی ہے ، عمر کے لیے دفتر قضا و قدر میں حکم دوام لکھا گیا ہے "

مجروح : سبحان اللہ ۔ کیا موتی پروئے ہیں ۔ حضور تو مجمع البحرین ہیں ۔ نظم چشمِ بدور ۔ نثر نورٌ علیٰ نور ۔

حالی : حضرت سخن کے اشعار حضور کو یاد ہوں تو سنائیے ۔

غالب : میرے حافظے کا حال تو تم جانتے ہی ہو ، شعر کس ملعون کو یاد رہتا ہے ۔

شیفتہ : ایک آدھ شعر شاید یاد آ جائے ۔

غالب : ہوں (وقفہ) خوب یاد آیا ۔ ایک تازہ غزل کے کچھ شعر آج ایک پرزے پر لکھ کر دے گیا تھا ۔ وہ شاید یہیں کہیں پڑا ہوگا پرزہ (وقفہ) یہ رہا ۔ سنو بھئی شیفتہ ۔

ملے نہ درد بھی ساقی شراب کے بدلے   جلے نہ کیونکہ مرا دل کباب کے بدلے

مجروح : خوب بہت خوب ۔
غالب : نہیں بھئی ۔ مطلع معمولی ہے جبھی شیفتہ چپ رہے ، اب دو شعر اور سنو :
شبیہہ یار کو بدلوں شبیہہ یوسف سے　　ورق غلام کا لوں آفتاب کے بدلے
سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر　　ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے
شیفتہ : سبحان اللہ ۔ موت کا لفظ کیا ذو معنی رکھا ہے ! اچھا شعر کہا ہے ۔
غالب : خواجہ الطاف حسین صاحب !
حالی : جی ارشاد ۔
غالب : اب آپ کانوں میں انگلیاں دے لیں ذرا ۔
مجروح : (ہنس کر) وہ کیوں ؟
غالب : اے میر مہدی یہ بھٹیرے مولوی ۔ مجھے شعر پڑھنا ہیں شراب کی تعریف میں ، جو یہ بگڑ گئے تو !
حالی : آپ کیوں مجھے شرمسار کرتے ہیں حضور !
غالب : تو سنو بھئی ۔
وہ بادہ کش ہوں کہ غفلت ہوئی تو ساقی نے　　دیا شراب کا چھینٹا گلاب کے بدلے
شیفتہ : سبحان اللہ شاگرد کا شعر سن کر استاد کا ایک شعر یاد آگیا ۔
غالب : یعنی میرا ۔
شیفتہ : جی ہاں :　آسودہ باد خاطر غالب کہ خوئے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را
واہ واہ ۔ رندی کے مضامین باندھنا خاص حضور کا حصہ ہے ۔ ہائے !
پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

شیفتہ : اور وہ شعر ؎

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

غالب : (ہنس کر) بھئی مجھے تو اپنا یہ شعر پسند ہے ؎

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

حالی : خوب، حضور نے کیا حیلۂ شرعی نکالا ہے۔

(تینوں ہنستے ہیں)

غالب سنا بھئی شیفتہ، نہیں چُو کے نا مولوی حالی! داد بھی فقہیوں اور مولویوں کی اصطلاح میں دی۔

شیفتہ : یہ سب آپ کا فیض ہے (وقفہ) اب اجازت مرحمت ہو۔ آج واپس جانے کا ارادہ ہے۔

حالی : مجھے بھی اجازت مرحمت ہو۔

غالب : بھئی جی تو نہیں چاہتا کہ تم دونوں چلے جاؤ۔ لیکن اب مجبوری ہے، ہاں بھئی اب دیوان کی طباعت کا کام تمہارے ذمے ہے۔

شیفتہ : آپ اطمینان رکھیں، میں خود تصحیح کر لوں گا۔ اچھا تسلیمات،

حالی : خدا حافظ،

غالب : فی امان اللہ۔

مظفر حسین شمیم

دیوانِ غالبؔ کی طباعت

میرٹھ ——————— شیفتہ کا مکان

منشی ممتاز علی: حضرت قبلہ ایک گرما گرم فارسی کا شعر یاد آیا۔

غالب: تو پھر سنائیے دیر کیوں کرتے ہیں نواب شیفتہ ذرا آپ بھی سنیے گا۔

شیفتہ: قبلہ میں سن رہا ہوں، ہاں! منشی صاحب فرمائیے وہ کون شعر ہے۔

منشی ممتاز علی: می خواہم از خدا و می خواہم از خدا ؛ دیدن حبیب را و ندیدن رقیب را

غالب: بھئی منشی صاحب معنی تو اس شعر میں ضرور موجود ہیں مگر بول چال ٹکسال باہر ہے ایک جملہ مقدّر چھوڑ دیا ہے۔ اور پھر اس بھونڈی شکل میں کہ المعنی فی بطن الشاعر۔

منشی ممتاز علی: حضرت مرزا صاحب گستاخی معاف ہو تو کچھ عرض کروں۔

غالب: فرمائیے۔

منشی ممتاز علی: حضرت کے اشعار میں بھی مقدر جملے ملتے ہیں۔

غالب: مثلاً

منشی ممتاز علی: آپ کا یہ شعر ہے:

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

"اب جو دور مجھ تک آیا تو ڈرتا ہوں" پورا جملہ مقدر ہے۔

غالب: بے شک یہ سارا جملہ مقدر ہے بلکہ میرا فارسی دیوان جو دیکھے گا وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑتا چلا جاتا ہوں مگر ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد یہ فرق وجدانی ہے بیانی نہیں۔

منشی ممتاز علی: قبلہ یہ کسی مستند استاد کا شعر ہے۔

غالب: یہ شعر اساتذۂ مسلم الثبوت میں سے کسی کا نہیں ہے کوئی صاحب ہونگے انھوں نے لوگوں کو حیران کرنے کے واسطے یہ شعر کہہ دیا اور کسی استاد کا نام لے دیا۔ کیوں نواب صاحب آپ کا کیا خیال ہے۔

شیفتہ: حضرت کا خیال بجا و درست ہے

منشی ممتاز علی: جناب مجھے تو اس شعر میں ایک صنعت بھی نظر آتی ہے۔

غالب: وہ کیا — ؟

منشی ممتاز علی: مراعاۃ النظیر!

غالب: (قہقہہ لگا کر) سنتے ہیں نواب صاحب!

شیفتہ (ہنستے ہوئے) جی ہاں پیر و مرشد!

غالب: جناب منشی صاحب اس شعر میں صنعت مراعاۃ النظیر کہاں البتہ لف و نشر مرتب ضرور ہے۔

ممتاز علی: منشی عظیم الدین صاحب اکثر آپ کے ایک دو شعر کے معنی مجھ سے پوچھا کرتے ہیں میں اپنی فہم ناقص کے مطابق انہیں معنی بتایا کرتا ہوں مگر انکی تسلی نہیں ہوتی۔

غالب: کیوں منشی عظیم الدین صاحب؟

منشی عظیم الدین: جی قبلہ!

غالب: ذرا میں بھی تو سنوں کہ وہ کونسے شعر ہیں۔
منشی عظیم الدین: قبلہ ایک شعر ہے۔ دیکھیے یاد آئے تو سناتا ہوں۔ ہاں یاد آیا:
یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
غالب: بھائی یہ شعر تو بالکل صاف ہے! کیوں نواب صاحب؟
شیفتہ: جی پیر و مرشد! بجا و درست۔
غالب: پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ آئینہ عبارت فولاد کے آئینے سے ہے، ورنہ حلبی آئینوں میں جوہر کہاں؟
منشی عظیم الدین: جی سمجھا۔
غالب: تو پھر یہ سمجھنا چاہیے کہ حلبی آئینوں کو کوئی صیقل نہیں کرتا۔
منشی عظیم الدین: جی قبلہ و کعبہ۔
غالب: فولاد کی جس چیز کو صیقل کروگے بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی اس کو الف صیقل کہتے ہیں۔
منشی عظیم الدین: جی بندہ پرور!
غالب: جب یہ مقدمہ معلوم ہوا تو اب اس مفہوم کو سمجھیے "چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا" یعنی ابتدائے سن تمیز سے مشق جنوں ہے ابتک کمال فن حاصل نہیں ہوا آئینہ تمام صاف نہیں ہوا بس وہی ایک لکیر صیقل کی جو ہے سو ہے کیوں منشی صاحب سمجھ میں آیا۔
منشی عظیم الدین: جی ہاں قبلہ سمجھ گیا۔
غالب: اور آپ منشی ممتاز علی صاحب۔
منشی ممتاز علی: حضرت اب مفہوم بالکل صاف ہوگیا۔
غالب: اب پورا شعر پڑھیے۔

منشی عظیم الدین: یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز۔ چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

شیفتہ: سبحان اللہ، کیا باریک معنی اس شعر میں پوشیدہ ہیں۔

منشی ممتاز علی: مرحبا! مرحبا!! یک الف بیش نہیں ......

سب: (بیک آواز) سبحان اللہ! سبحان اللہ!!

غالب: اور کسی شعر کا مفہوم دریافت کرنا ہو تو دریافت فرمالیجے۔

منشی عظیم الدین: اور دو ایک شعر بھی تھے مگر اس وقت یاد نہیں آتے پھر کسی موقع پر پوچھ لوں گا۔

غالب: خیر پھر کبھی سہی۔

منشی ممتاز علی: حضرت قبلہ آپ کی خدمت میں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں۔

غالب: ہاں ہاں! شوق سے فرمایئے کیا بات ہے؟

منشی ممتاز علی: قبلہ آپ کا دیوان ریختہ بازار میں نہیں ملتا اس کی بڑی مانگ ہے اسے پھر سے چھپوا لیا جائے تو بہتر ہے۔

غالب: منشی صاحب میں چھپوانے کو تو چھپوا لوں مگر میرا اپنا تو کوئی چھاپہ خانہ نہیں۔

منشی ممتاز علی: قبلہ آپ کو خود چھپوانے کی کیا ضرورت منشی عظیم الدین چھپوانے کو تیار ہیں مدتوں سے مجھ سے کہتے چلے آئے ہیں کیوں منشی صاحب؟

منشی عظیم الدین: اگر مجھے اس کے چھاپنے کی اجازت مل جائے تو اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے میں تو ایک زمانے سے عرض کرتا چلا آرہا ہوں۔

منشی ممتاز علی: جناب والا نے سماعت فرمایا؟ منشی عظیم الدین کیا عرض کر رہے ہیں زہے نصیب کہ اس مرتبہ آپ میرٹھ تشریف لے آئے اور منشی عظیم الدین کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

غالب: اچھا منشی صاحب آپ ہی چھپوا لیجئے۔

منشی عظیم الدین: شکر ہے میری مدتوں کی تمنا بر آئی۔
غالب: لیکن اس کی تصحیح کا ذمہ کون کرتا ہے۔
منشی ممتاز علی: کاپیاں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ دیکھ لیا کریں گے کیوں نواب صاحب؟
شیفتہ: میں اس کام کے لیے بسر و چشم حاضر ہوں۔ اور اس خدمت کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔

(وقفہ)

دہلی ——————— غالب کا مکان

منشی شیونرائن: آداب عرض ہے قبلہ! کورنش بجالاتا ہوں۔
غالب: آؤ بھائی منشی شیونرائن جی تسلیم، کہو بال بچے تو خیریت سے ہیں اور تمہارا مزاج کیسا ہے۔
شیونرائن: آپ کی دعا سے سب اچھے ہیں اور میں بھی ٹھیک ہی ہوں۔
غالب: بھائی مونڈھے پر بیٹھ جاؤ اور کہو آگرہ سے کب آنا ہوا۔
شیونرائن: ابھی ابھی چلا آرہا ہوں۔ (کچھ خاموشی)
غالب: میاں ایسے چپ منہ میں گھنگنیاں ڈالے کھڑے کیوں ہو کہتا ہوں بیٹھ جاؤ۔
شیونرائن: حضرت جب آپ نے اپنوں کو بیگانہ سمجھ لیا تو کیا خاک بیٹھوں۔
غالب: (گھبرا کر) بھائی مجھ سے ایسی کون سی خطا ہو گئی۔ تمہارے سر کی قسم! تمہاری اس بات سے مجھے الجھن سی ہونے لگی۔ میری جان ذرا صاف صاف کہو،

(کچھ خاموشی)

ارے میاں کچھ منہ سے بولو کچھ سر سے کھیلو کچھ اپنی کہو کچھ ہماری سنو۔
شیونرائن: ہونا کیا؟ آپ نے یہ کیا غضب کیا کہ اپنے گھر کا مطبع ہوتے ہوئے

دیوان میرٹھ میں ایک اجنبی کو چھاپنے کے لیے دیدیا۔

غالب: میاں اس میں میری کیا خطا مجھے کیا معلوم تھا کہ تم اسے چھپوانا چاہتے ہو؟ ورنہ میں اس نامعقول شخص کو کیوں اجازت دیتا۔

(پاؤں کی چاپ سیف الحق سیاح کی آمد)

سیف الحق: آداب عرض ہے قبلہ! منشی صاحب تسلیم۔

غالب: آؤ بھائی سیف الحق آؤ کیا خوب وقت پر آئے۔

شیو نرائن: تسلیم عرض ہے آیئے سیاح صاحب تشریف لایئے۔

سیف الحق: کہیے قبلہ مزاج کیسا ہے آپ کچھ پریشان نظر آتے ہیں؟ اس پریشانی کی وجہ؟

غالب: بھائی کیا بتاؤں کس مصیبت میں گرفتار ہوں؟ ایک ناآشنا شخص جس کا نام عظیم الدین اور وطن میرٹھ ہے مجھ سے چھاپنے کے لیے میرا دیوان مانگ کر لے گیا ہے۔

سیف الحق: بہت خوشی کی بات ہے آپ اسے چھاپنے دیجیے۔

غالب: مجھے اس کے مطبع میں اپنا دیوان چھپوانا منظور نہیں وہ کمبخت آدمی نہیں بھوت ہے پلید ہے غول ہے. غاصب ہے. ناانصاف ہے کیا بتاؤں کیا بلا ہے۔

سیف الحق سیاح: حضرت اتنا بگڑنے کی کیا ضرورت ہے اس سے واپس منگوالیجیے۔

غالب: تم بھی دعا کرو کہ اس سے مسودہ واپس مل جائے اور اس عذاب سے میری جان نجات پائے۔

سیف الحق سیاح: حضرت یہ کونسی مشکل بات ہے ایک خط نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کو لکھیے وہ منشی عظیم الدین سے دیوان حاصل کر کے بھیج دیں گے۔

شیونرائن: حضرت سیاح کی رائے بالکل درست ہے حضرت یہ قلم دوات لیجیے اور خط لکھ ڈالیے۔

(کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ)

(وقفہ)

میرٹھ ______ شیفتہ کا مکان

(پاؤں کی چاپ، پھر دروازہ کھلنے کی آواز)

شیفتہ: کون ؟ منشی عظیم الدین صاحب۔

منشی عظیم الدین: آداب عرض ہے نواب صاحب آداب عرض۔

شیفتہ: تسلیم! تسلیم! آیئے تشریف لایئے۔

منشی عظیم الدین: جناب والا نے آج نا وقت اس نیاز مند کو کیسے یاد فرمایا۔

شیفتہ: میرزا صاحب قبلہ کا خط آیا ہے۔

منشی عظیم الدین: انھوں نے کیا تحریر فرمایا ہے۔

شیفتہ: (خط دیتے ہوئے) پڑھ لیجیے۔

(کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ)

منشی عظیم الدین: (خط کھول کر باآواز بلند پڑھتے ہیں)

"جناب مستطاب نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کو فقیر غالب کا سلام پہنچے ایک عجیب الجھن میں گرفتار ہوں اور اس کے مداوے کا آپ سے خواستگار ہوں۔ منشی شیو نرائن میرے دیوان ریختہ کو اپنے مطبع میں چھپوانا چاہتے ہیں ان کا اور میرا معاملہ واحد ہے یعنی ان کا مطبع میرا اپنا مطبع ہے وہ میرے قدیم آشنا ہیں ان کی خاطر مجھے ہر حال میں عزیز ہے میں انہیں غیر نہیں جانتا، منشی صاحب بصر ہیں

کہ دیوان ان ہی کے مطبع میں چھپوایا جائے کسی اور کو چھاپنے کے لیے نہ دیا جائے اب میں اس باب میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں۔ از راہ بندہ نوازی منشی عظیم الدین سے دیوان کا مسودہ حاصل کر کے بتعجیل مجھے ارسال فرمائیے تا کہ میں اسے منشی شیو نرائن کے حوالے کر دوں میں یہ خط لکھ رہا ہوں اور منشی شیو نرائن میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں اس خط کو تار سمجھیے اسے دیکھتے ہی منشی عظیم الدین کو طلب فرمائیے اور جس طرح بنے ان سے دیوان کا مسودہ لے لیجیے۔ فقط۔

آپ کی خیریت کا طالب

غالب

(کچھ خاموشی)

منشی عظیم الدین: جناب والا میں تو کاپیاں تحریر کروا چکا ہوں۔

شیفتہ: مجبوری ہے کیا کیا جائے، آپ خط دیکھ چکے ہیں مسوّدہ مرزا صاحب کو بھیجنا ضروری ہے۔

منشی عظیم الدین: میرا تو بڑا نقصان ہو جائے گا۔

شیفتہ: اب یہ معاملہ میرے ہاتھ میں نہیں رہا۔

منشی عظیم الدین: (کچھ اونچی آواز سے) تو اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔

شیفتہ: مسودہ لا کر میرے حوالے کیجیے۔

منشی عظیم الدین: گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل یہ عجیب معاملہ ہے میں تو کہیں کا نہ رہا۔

شیفتہ: (ذرا بگڑ کر) زیادہ باتیں نہ بنائیے جلد جائیے۔ مسودہ لیتے آیئے ڈاک کا وقت جا رہا ہے ایک گھنٹہ باقی رہ گیا ہے (کچھ خاموشی) اب تک آپ نہیں گئے

(بلند آواز سے) جناب منشی صاحب فوراً جلائیے۔ جلدی کیجے، بہت جلدی۔

(وقفہ)

دہلی ——————— غالب کا مکان

(پہلے دور سے اور پھر نزدیک سے پاؤں کی چاپ)

غالب: کون؟

مجروح: میں ہوں مجروح! آداب عرض ہے قبلہ!

غالب: آؤ میاں میر مہدی مجروح آؤ، بیٹھو، کہو کیسے آئے۔

مجروح: سنا ہے کہ جناب کا دیوان ریختہ چھپ کر بازار میں آگیا ہے۔

غالب: دیوان چھپا کیا، ابتدا سے انتہا تک غلط دلّی پر دلّی کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت۔ لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اسے آسمان پر چڑھا دیا حسن خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ القاب و آداب ایسے لکھے کہ بس۔ لیکن دلّی والے صاحب دیوان کو ایسے یاد کرتے ہیں جیسے کتے کو آواز دی جائے۔ دیوان مرزا نوشہ کا نہ نجم الدولہ نہ دبیر الملک۔

مجروح: آخر ایسا ہوا کیسے۔

غالب: پہلے یہ میرٹھ میں چھپنے والا تھا۔ مگر منشی شیو نرائن کے اصرار پر اسے آگرہ میں ان کے مطبع میں چھپوانا منظور کیا۔

مجروح: خوب۔

غالب: جب وہاں دیر ہوئی تو میرے دل میں یہ خیال گزرا کہ اب منشی جی نے اس کے چھاپنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے اس لیے دلی میں چھپوا لیا۔

مجروح: اچھا! یہ بات ہوئی۔

غالب: چھپنے کے دوران میں ہر کاپی خود دیکھتا رہا ہوں، کاپی نگار اور تھا اور

جو شخص میرے پاس کاپی لاتا تھا وہ اور۔

مجروح: جی!

غالب: اب جو دیوان چھپا ایک نسخہ بطور حق تصنیف مجھے بھی ملا غور کرتا ہوتا ہوں تو وہ الفاظ جوں کے توں ہیں یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے ناچار غلط نامہ لکھا وہ چھاپ کر اس میں ٹانک دیا گیا۔

مجروح: یہ تو کچھ اچھا نہ ہوا۔

غالب: بہر حال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا مگر سچ کہتا ہوں کہ جب اسے دیکھو گے تو میری طرح تم بھی خوش نہ ہو گے۔

مجروح: یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے خیر اب تو یہ چھپ ہی چکا ہے جتنی جلدیں ہوں انہیں بکوانے کی جلد از جلد کوشش کرنی چاہیے۔ میرے پاس بھی کچھ خریدار ہیں کچھ نسخے ان میں بھی بک جائیں گے۔

غالب: اگر یہ ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا۔

مجروح: ہاں ہاں کیا مشکل ہے مگر اس کی قیمت کیا رکھی ہے۔

غالب: (بگڑ کر) قیمت سے مجھے کیا واسطہ میں دلال نہیں مہتمم مطبع نہیں مطبع محمدی کے مالک محمد حسین خاں مہتمم مرزا امو جان مطبع شاہدرہ میں۔

مجروح: قبلہ آپ خفا کیوں ہوتے ہیں؟

غالب: میاں تم بات ہی ایسی پوچھتے ہو بھلا میں قیمت ویمت کیا جانوں محمد حسین خاں رائمال کے کوچے میں مصوروں کی حویلی کے پاس رہتے ہیں قیمت پوچھنا ہو تو ان سے پوچھو (کچھ ٹھہر کر اور پھر چیخ کر) آیا خیال شریف میں؟ (بڑبڑاتے ہیں) قیمت۔ قیمت۔ قیمت۔ گویا مجھے کتاب فروش سمجھ رکھا ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ!!

مظفر حسین شمیم

غالب قید میں

تفتہ: قبلہ! کل آپ مفتی صدرالدین آزردہ کے مشاعرے میں شریک نہ ہوئے۔

غالب: ایک تو درد کمر دوسرے بارش شرکت نہ کرسکا مفتی صاحب کو معذرت نامہ بھیج دیا تھا۔ کیوں مشاعرہ کیسا رہا؟

تفتہ: بڑا کامیاب رہا۔ لالہ مکندی لال بھی تو وہاں موجود تھے۔

غالب: کیوں لالہ جی؟

مکندی لال: جی ہاں قبلہ میں بھی ایک دوست کے ساتھ ادھر جا نکلا تھا۔

غالب: کیوں تفتہ مشاعرے میں کوئی اچھا شعر بھی ہوا؟۔

تفتہ: سلطان الشعراء نے ایک عجیب شعر کہا۔

غالب: وہ کیا؟

تفتہ: اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے ؛ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

غالب: کیا واقعی یہ ذوق کا شعر ہے؟

تفتہ: جی ہاں قبلہ یہ انہیں کا شعر ہے۔

غالب: بھئی جس کسی کا بھی ہو شعر خوب ہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے ؛ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مرحبا مرحبا کیا شعر کہا ہے ! سبحان اللہ !!

مکندی لال : کیوں بھئی مہتا رام وہ تم اس روز حضرت ذوق کا کوئی شعر سنا رہے تھے ۔

مہتا رام : کونسا شعر ؟

مکندی لال : وہی جس کا قافیہ شاید روشنی تھا ۔

مہتا رام : ہاں ہاں یاد آ گیا ؎

پڑا ہے اس تیرہ خاکداں میں یہ آدمی کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیل عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے

غالب : بہت خوب ! بہت خوب !!

تفتہ : آپ کی وہ غزل جس کا مقطع ہے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب ؛ کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

ولیعہد بہادر کے دربار میں گائی جا رہی تھی ۔

غالب : یہ کب کی بات ہے ۔

تفتہ : یہی کوئی چار روز کی بات ہو گی ۔

غالب : تم سے کس نے کہا ؟

تفتہ : حکیم مومن خاں کہہ رہے تھے کہ انہوں نے یہ بات کسی مرشد زادے سے سنی تھی ۔

مکندی لال : جناب والا آپکی ایک غزل تو شہر کے ہر گلی کوچے میں گائی جا رہی ہے ۔

غالب : کونسی غزل ؟

مکندی لال : وہی دیکھیے نا — اس کا کوئی شعر اس وقت یاد نہ رہا ۔ بھائی مہتا تمہیں تو یاد ہو گا ؟

مہتا رام : وہی جس کا ایک شعر ہے

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو　　کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

مکندی لال: نہیں یہ نہیں — نہیں دیکھیے یاد آگیا وہی جس کا مقطع ہے،

غالب چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی　　پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

غالب: (ہنستے ہوئے) لالہ جی میں اصل میں فارسی کا شاعر ہوں ریختہ میں یوں ہی کبھی کبھی کبھار تفریحاً کچھ کہہ لیا کرتا ہوں۔

مکندی لال: اجی قبلہ مرزا صاحب یہ آپ کی خاکساری ہے ورنہ آج دلّی بھر میں آپ جیسا ریختہ کا کون شاعر ہے۔

غالب: یہ آپ کی بندہ پروری ہے ورنہ میں کیا اور میری شاعری کیا۔

(سب کا قہقہہ لگانا — کچھ خاموشی)

تفتہ: ایک بات دریافت طلب تھی۔

غالب: وہ کیا؟

تفتہ: پروانہ اور نجانہ کے ساتھ مردانہ اور دلیرانہ کے قافیے جائز ہیں یا ناجائز۔

غالب: میاں یہ بالکل ناجائز اور نامستحسن ہیں یہ ایطا ہے اور وہ بھی ایطائے قبیح۔

تفتہ: قبلہ دیدۂ مست کی ترکیب صحیح ہے یا غلط؟

غالب: بھائی اس کے بجائے چشم پر خمار لکھو۔

تفتہ: بندہ پرور ایک مصرع ہوا ہے:

گردشِ چرخ استخواں سائید

غالب: (کچھ سوچ کر) اسے یوں بنالو۔

سودہ شد استخواں ز گردشِ چرخ

تفتہ: میں ایک غزل لکھ رہا ہوں اس کا ایک مصرع ہے:

دیگر نتواں گفت غمت را کہ غم است ایں

غالب: تفتہ تمہیں شعر کہتے اتنی مدت ہو گئی اور اب تک تقطیع کرنا بھی نہ آیا میاں غور کرو بعد غور کے اس ناموزونی کا خود اقرار کرو گے۔

تفتہ: قبلہ ایک شعر اور ہے۔

غالب: بھائی اس گفتگو کو چھوڑو کوئی اور بات سناؤ کبھی پوچھتے ہو فلاں شعر کا کیا مطلب ہے کبھی پوچھتے ہو فلاں مصرعہ کا وزن صحیح ہے یا نہیں کبھی دریافت کرتے ہو کہ یہ ترکیب جائز ہے یا ناجائز کچھ آپ بیتی کہو کچھ جگ بیتی سناؤ یہ موقع نہ اس گفتگو کا ہے اور نہ یہ وقت ایسی گفتگو کے لیے موزوں ہے۔ کہو آج کا احسن الاخبار دیکھا ہے؟

تفتہ: جی ہاں دیکھا ہے۔

غالب: کوئی اہم خبر ہو تو سناؤ۔

تفتہ: نواب ریذیڈنٹ بہادر نے اس آدم خور شیر کا شکار کر لیا جو فیروزپور جھرکہ کے جنگل میں تھا۔

مکندی لال: یہ کب کا واقعہ ہے۔

تفتہ: آج سے تیسرے دن کا۔

مہتا رام: بہت اچھا ہوا یہ شیر بڑا خطرناک تھا ایک نہ دو اکھٹے پچیس آدمیوں کو کھا چکا تھا۔

غالب: خس کم جہاں پاک میاں اور کوئی خبر!!

تفتہ: آج کل بارش کی وجہ سے شہر میں اکثر مکانات گر رہے ہیں خانم کا بازار اردو بازار اور فراش خانے میں چار سو کے قریب مکان گر پڑے۔

غالب: بھائی برسات کیا ہے ایک قیامت ہے خود میرے گھر کا یہ حال ہے کہ

مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا وہ گر گیا سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں. صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے کتابیں قلمدان توشہ خانہ میں ہیں فرش پر کہیں لگن رکھی ہے کہیں چلمچی دھری ہوئی ہے۔

تفتہ: آپ مالک مکان کو مرمت کرانے کے لیے کیوں نہیں کہتے؟

غالب: مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے، مینہ ہفتہ دو ہفتے بند ہو تو مرمت کا سامان ہو پھر اثنائے مرمت میں کس طرح بیٹھا رہوں!

تفتہ: یہ تو بڑی مصیبت ہے۔

غالب: اور کوئی خبر ہو تو سناؤ۔

تفتہ: اور تو کوئی اہم خبر ہے نہیں۔

غالب: خیر!

(کچھ خاموشی)

تفتہ: قبلہ مجھے میر مہدی مجروح سے ملنے جانا ہے۔ اب اجازت دیجیے۔

غالب: ہاں بھائی جاؤ۔

تفتہ: آداب عرض ہے۔

غالب: تسلیم۔ تسلیم دیکھنا میاں کل ضرور آنا اگر وقت ملا تو تمہاری غزل بنا رکھوں گا۔

(کچھ خاموشی)

مکندی لال: کہیے مرزا صاحب چوسر نکالی جائے؟

مہتارام: ہاں لالہ مکندی لال جی ضرور نکالیے۔

غالب: جی تو نہیں چاہتا لیکن اگر آپ کی مرضی ہو تو نکالیے۔

(بساط بچھائی جاتی ہے کوڑیاں پھینکنے کی آواز)

مکندی لال: مرزا صاحب کیا یہ بازی جیتنے کا ارادہ ہے؟

غالب: (قہقہہ لگاتے ہوئے) آپ کا منشا یہ ہے کہ ہمیشہ آپ ہی جیتا کریں؟

مکندی: ارے بھائی مہتا رام سنتے ہو مرزا صاحب کیا فرما رہے ہیں؟

مہتا رام: فرما کیا رہے ہیں؟ ٹھیک کہتے ہیں۔ مرزا صاحب نے تو شاعری میں اپنی عمر گنوا دی ورنہ ان کی ٹکر کا چوسر کھیلنے والا دلی بھر میں نہیں نکلتا۔

غالب: (ہنستے ہوئے) دیکھیے لالہ جی یہ لو بارہ (کوڑیاں پھینکنے کی آواز) بازی میں جیتا (زور سے قہقہہ لگاتے ہیں)

(دور سے جوتوں کی آوازیں)

مکندی لال: ہیں ادھر سے یہ کون لوگ چلے آ رہے ہیں؟

(جوتوں کی آواز سے لوگوں کا قریب آنا محسوس ہوتا ہے)

مہتا رام: (گھبرائی ہوئی آواز میں) پولس! پولس! (کانپتے ہوئے) لالہ مکندی لال جی اب کیا ہوگا پولس آ گئی ہائے ہائے اب کیا ہوگا۔

پولس والے: (بیک آواز) پکڑو۔ پکڑو! ان جواریوں کو پکڑو دیکھنا ان میں سے کوئی بھاگنے نہ پائے۔

(مکندی لال اور مہتا رام بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں قدموں کی آواز)

تھانیدار: یہ دونوں بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں جوانو بڑھ کر ان دونوں کی مشکیں کس لو۔

مہتا رام: (تھرائی ہوئی آواز میں) تھانیدار صاحب رحم کیجیے غلطی ہو گئی اب۔ ۔ اب ــ حضور ــ حضور ــ ہم ایسا نہیں کریں گے ہمیں چھوڑ دیجیے ــ لالہ مکندی لال جی کو تو مرزا صاحب نے بہکایا تھا۔

غالب: (غصے سے) سبحان اللہ کمبخت جھوٹا کہیں کا اجی تھانیدار صاحب یہ مردود جھوٹ بکتا ہے اور اگر سچ بھی کہے تو چوسر کھیلنا کوئی جرم نہیں ہے۔

تھانیدار: جی بجا ارشاد بندہ پرور! چوری اور سینہ زوری اسی کو کہتے ہیں (کچھ خاموشی) اخاہ آپ ہیں خوب! خوب!! اب میں سمجھا (قہقہہ لگاتے ہوئے) مرزا اسد اللہ خاں غالب!

غالب: تھانیدار صاحب ہوش کی دوا کیجے آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں؟

تھانیدار: جناب والا یہ کوئی مشاعرے کی محفل نہیں ہے اس وقت آپ جوئے کی علت میں زیر حراست ہیں سمجھے جناب آپ سے میں جو کچھ کہوں اس کی تعمیل بے چون و چرا کرنی پڑے گی۔

غالب: مگر........!

تھانیدار: ہیں اگر مگر کچھ نہیں جانتا آپ چپ چاپ میرے پیچھے چلے آیئے۔ (سپاہیوں سے) جوانو! ذرا ان دونوں لالاؤں کی مشکیں مضبوطی سے کس لینا۔ کہیں یہ راستے سے بھاگ نہ نکلیں۔

مہتا رام اور رگھو ناتھ لال: (ساتھ ساتھ روتے ہوئے) ہائے ہائے ہم مرے بھگوان کے لیے ہمیں چھوڑ دو۔

غالب: نہ معلوم آج صبح کس منحوس کی صورت دیکھ کر اٹھا تھا ــــ آدم کے بیٹے پر جو بھی گزر جائے وہ کم ہے یہ بھی خدا کی قدرت ہے۔

تھانیدار: مرزا صاحب! زیادہ باتیں نہ بنایئے چپ چاپ چلے چلیے۔

غالب: (رک کر) عجیب واہیات انسان سے پالا پڑا ہے کیا تجھے نہیں معلوم کہ ہم کون ہیں؟۔

تھانیدار: جی بندہ نواز مجھے سب کچھ معلوم ہے مگر اس وقت آپ کی حیثیت ایک

ملزم سے زیادہ کچھ نہیں۔

غالب: (بڑبڑاتے ہوئے) عجیب احمق ہے ــــ یہ آدمی کاہے کو ہے اچھا خاصا پاجامہ ہے!

(وقفہ)

چپراسی: (بآوازِ بلند) مرزا اسداللہ خاں غالب، لالہ مکندی لال اور لالہ مہتارام ملزمان حاضرِ عدالت ہیں۔

(کاغذوں کی کھڑکھڑاہٹ۔ کچھ خاموشی)

مجسٹریٹ: اچھا انسپکٹر صاحب آپ اپنا چالان پیش کیجیے۔

کورٹ انسپکٹر: کل رات مرزا اسداللہ خاں غالب لالہ مکندی لال اور لالہ مہتارام چوسر پر بازی لگاتے ہوئے گرفتار ہوئے۔ لالہ مکندی لال اور لالہ مہتارام کو اپنے جرم کا اعتراف ہے اور اس شرط پر گواہی دینے پر آمادہ ہیں کہ ان کا گناہ معاف کر دیا جائے۔

مجسٹریٹ: لالہ مکندی لال اور لالہ مہتارام کو پولس کی درخواست پر معاف کیا جاتا ہے۔

مکندی لال: حضور والا! مرزا غالب اور میں کبھی کبھی چوسر کھیل لیا کرتے تھے۔ کھیل سے پہلے ہم بازی لگاتے تھے جو ہارتا وہ بازی کی مقررہ رقم ادا کرتا کل رات بھی ہم اسی طرح کی بازی لگا کر چوسر کھیل رہے تھے اتنے میں پولس کی دوڑ آگئی اور ہم گرفتار ہو گئے۔

مجسٹریٹ: لالہ مہتارام تم کیا کہنا چاہتے ہو۔

مہتارام: لالہ مکندی لال نے جو کچھ کہا وہ سرکار کمپنی بہادر کے اقبال سے حرف بحرف صحیح ہے۔

مجسٹریٹ : کیوں مرزا صاحب آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ۔

غالب : بندہ نواز میرا بیان یہ ہے کہ میں چوسر کھیل رہا تھا. چوسر کھیلنا کوئی جرم نہیں ۔

مجسٹریٹ : بیشک چوسر کھیلنا کوئی جرم نہیں مگر اس پر بازی لگانا جرم ہے کیا آپ نے اس پر بازی نہیں لگائی ؟

مکندی لال اور مہتا رام : (بیک آواز) ہاں ہاں رام کی سوگند انھوں نے بازی لگائی تھی ۔

غالب : یک نہ شد دو شد جناب مجسٹریٹ صاحب ان کمبختوں نے تو خود مجھے بازی لگانے پر آمادہ کیا تھا ۔

مجسٹریٹ : اچھا تو آپ کو اپنے جرم کا اقبال ہے ۔

غالب : بیشک میں نے بازی لگائی مگر مقصد محض تفریح طبع تھا ۔

مجسٹریٹ : خیر تو اب میں اپنا فیصلہ سنانا چاہتا ہوں ۔

(تھوڑی خاموشی کے بعد فیصلہ سناتا ہے)

آپ اسداللہ خاں غالب ساکن حبش خاں کا پھاٹک کو قمار بازی کی علت میں چھ ماہ قید با مشقت اور دو سو روپیہ جرمانہ — جرمانہ کی رقم داخل سرکار نہ کی گئی تو مزید چھ ماہ کی قید بھگتنا پڑے گی البتہ اتنی رعایت کی جاتی ہے کہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے گئے تو مشقت معاف ہو جائے گی ۔ نیز لالہ مکندی لال اور لالہ مہتا رام ساکنان خاص بازار کو وعدہ معاف گواہ ہونے کی بنا پر رہا کیا جاتا ہے ۔

مکندی لال اور مہتا رام (دونوں باآواز بلند) سرکار کمپنی بہادر کا اقبال بلند ہو مجسٹریٹ صاحب بہادر کا سایہ شہر پر ہمیشہ قائم رہے ۔

(وقفہ)

(لوگوں کے چلنے پھرنے کی آواز)

ایک شخص: بھئی دیکھا آخر مرزا غالب بیچارے کو سزا ہو ہی گئی انھوں نے ایسا جرم ہی کونسا کیا تھا۔

دوسرا شخص: اجی یہ سب کچھ ظالم کوتوال کا کیا دھرا ہے ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ حاکم وقت سے بگاڑ اچھا نہیں۔

تیسرا شخص: اجی کوتوال ایسا کونسا بڑا حاکم ہے؟ جس مجسٹریٹ نے مرزا صاحب کو سزا دی وہ خود کوتوال کا حاکم ہے وہ کمبخت مرزا صاحب کو خوب جانتا ہے لیکن عین وقت پر انجان بن گیا۔

پہلا شخص: سنا ہے کہ سیشن میں اپیل ہوئی تھی اس کا بھی کچھ مفید نتیجہ نہ نکلا سیشن جج بھی مرزا صاحب کا پرانا شناسا تھا۔

دوسرا شخص: آپ سیشن جج کا تذکرہ کر رہے ہیں حضرت صدر میں بھی سلسلہ جنبانی کی گئی تھی ہم نے تو یہاں تک سنا ہے کہ حضرت جہاں پناہ نے نواب ریذیڈنٹ بہادر کو بھی سفارشی چٹھی لکھی مگر وہاں سے بھی ٹکا سا جواب آگیا۔

تیسرا شخص: ارے بھائی جب قسمت بگڑتی ہے تو یونہی ہوتا ہے مرزا صاحب عرصے سے بیمار رہتے ہیں بادام کے ہریرے اور ذرا سے تلے چپاتی پر انکی زندگی کا دار و مدار ہے جیل کی مشقت سے ان کا جانبر ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ اللہ رحم کرے۔

پہلا شخص: خدا بھلا کرے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا بھئی دوست ہو تو ایسا ہو اس آڑے وقت میں انھوں نے مرزا صاحب کا بڑا ساتھ دیا۔

دوسرا شخص: سنا ہے کہ انھوں نے جرمانے کی رقم اپنی جیب خاص سے ادا کر دی ہے۔

تیسرا شخص: اجی آپ جرمانے کی رقم کو لیے بیٹھے ہیں انھوں نے پچاس روپے بھی اپنے پاس سے سرکار میں جمع کر دیئے ہیں کہ مرزا صاحب مشقت سے بچ جائیں۔

پہلا شخص: یہ بھی سنا گیا ہے کہ انھوں نے حکام سے کہہ سن کر مرزا صاحب کو گھر سے کھانا کپڑا منگولنے اور عزیزوں اور دوستوں سے ملنے جلنے کی اجازت بھی دلوا دی ہے۔

دوسرا شخص: میاں قید پھر قید ہے خدا دشمن پر بھی ایسا وقت نہ ڈالے۔

(وقفہ)

(پہلے دور سے پھر نزدیک سے پاؤں کی چاپ)

غالب: ادھر یہ کون آرہا ہے۔

تفتہ: آداب عرض ہے قبلہ: میں ہوں ہرگوپال تفتہ۔

غالب: (آہ سرد کھینچ کر) آؤ میاں تفتہ آؤ بیٹھو کہو مزاج کیسا ہے؟

تفتہ: میں تو اچھا ہوں قبلہ آپ اپنے مزاج کی کیفیت کہیے۔

غالب: (کھانستے ہوئے) میاں کیا کہوں کبھی سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا اور رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا اب بدنام ہوگیا ہوں اس قید سے عزت پر بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔

تفتہ: (روتے ہوئے) حضور کو قید خانہ میں دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے ہائے قسمت نے کیا برا دن دکھایا ہے۔

غالب: (کھانستے ہوئے) میاں میں تو ہر حال اور ہر رنگ میں راضی برضا ہوں میں ہر کام کو خدا کی طرف سے جانتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں چاہتا۔ جو گزر رہا ہے اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر راضی ہوں (کھانسنا) اتنا ضرور ہے کہ اب میری آرزو یہ ہے کہ دنیا میں

نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں روم ہے مصر ہے ایران ہے بغداد ہے۔ کعبہ آزادوں کی جائے پناہ ہے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئے گا۔ کہ اس قید سے نجات پاؤں اور سر بصحرا نکل جاؤں (کھانسنا)

تفتہ: قبلہ اس قدر مایوس نہ ہونا چاہیے۔ خدا کو فضل کرتے دیر نہیں لگتی۔ میں آپ کو یہ خوشخبری سنانے آیا ہوں کہ مجسٹریٹ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ اس نے صدر میں تحریک کی ہے۔ کوئی دیر میں رہائی کا حکم آیا چاہتا ہے

غالب: "ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"

(دور سے جوتوں کی آواز آتی ہے)

تفتہ: دیکھیے جیلر ہاتھ میں کوئی پرزہ لیے چلا آرہا ہے۔

(قریب سے جوتوں کی آواز)

خدا کرے یہ رہائی کا پروانہ ہو۔

(جیلر کا آنا)

تفتہ: آیئے جیلر صاحب آیئے۔

جیلر: (خوشی کے لہجے میں) مرزا صاحب مبارک! صدر سے آپ کی رہائی کا حکم وصول ہوا ہے۔ اب آپ آزاد ہیں جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔

غالب: (طنزیہ انداز میں) جناب ہم سے قیدیوں کو آزادی کہاں پہلے گورے کی قید میں تھے، اب کالے کی قید میں جائیں گے۔

حمیدہ سلطان احمد

غالبؔ اور تیلن

امی جمی کے دن ہیں، لال قلعے میں حضرت بہادر شاہ رونق افروز ہیں، دِلّی نے آخری سنبھالا لیا ہے، جہان آباد باکمالوں سے آباد ہے، علم و فن کی جمنا ہر طرف لہریں لے رہی ہے، گلزارِ شعر و ادب ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ کے دم سے ہرا بھرا ہے، شعر و سخن کا ذوق دلّی والوں کے رگ و پے میں رچ گیا ہے۔

قلعے میں بھی سالانہ ایک یا دو مشاعرے ضرور ہوتے ہیں، اِن مشاعروں میں جہاں پناہ خود بدولت تشریف لاکر شعرا کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں، رؤسا اور امرار کے دیوان خانوں میں بھی شعر و شاعری کا چرچا رہتا ہے۔ وہ دیکھیے اِس وقت بھی نواب ضیاء الدین خاں نیّرؔ رخشاں کے دیوان خانے بیت الضیاء میں بزم ادب آراستہ ہے، مئی کا تپتا ہوا مہینہ ہے اس لیے مرمریں فرش کو چھڑکاؤ سے ٹھنڈا کیا گیا ہے۔ نواب صاحب سفید تنزیب کا کرتہ ایک برا پائجامہ اُس پر سفید جامدانی کی سینہ کشا پہنے سیاہ مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی لگائے پیچوان کی نَے ہاتھ میں لیے سوزن کاری کام کی سفید براق سوزنی پر گاؤ تکیے کے سہارے آن بان سے بیٹھے ہیں، خوش رو اور جامہ زیب آدمی ہیں نواب صاحب کے سامنے

دو تپائیوں پر چنبیلی موتیا گلاب کے پھول بلوری چنگیروں میں رکھے ہیں اور ان کے دائیں جانب مفتی صدرالدین آزردہ ہیں اور بائیں جانب میر مہدی مجروح اور مولانا صہبائی بیٹھے ہیں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کو آتے دیکھ کر نواب صاحب نے نیم قد کھڑے ہو کر کہا " آئیے بھائی شیفتہ! ابھی مفتی صاحب سے آپ کا ذکر ہو ہی رہا تھا کہ آپ تشریف لے آئے۔ ماشاءاللہ عمر آپ کی بڑی ہے۔

شیفتہ: (مسکرا کر) شیطان کا ذکر کیا جائے تو وہ بھی موجود ہو جاتا ہے، وعدہ تو میں نے کل بھی آنے کا کیا تھا مگر حکیم صاحب کے یہاں اتنی دیر ہو گئی کہ یہاں آنے کا وقت نہیں رہا۔

صہبائی: کہیے مفتی صاحب! اب قلعے میں مشاعرہ کب ہو رہا ہے۔

مفتی صاحب: ابھی تو حضور والا نے کوئی تاریخ مقرر نہیں فرمائی حکیم احسن اللہ خاں کہہ رہے تھے، منشی فیض پارسا کے یہاں کے مشاعرے میں جو چپقلش ہوئی۔ اس کی خبر جہاں پناہ کو بھی مل گئی۔ وہ فرما رہے تھے اماں معاصرانہ نوک جھونک ہوتی تو خیر بری نہیں لگتی، لیکن یہ کا نضیحتی ہمیں پسند نہیں۔ استاد ذوق ہمارے استاد ہیں اور بادولت کو بہت عزیز ہیں۔ ان کی شاعری دلی کے روزمرہ میں ہوتی ہے، اس لیے عوام پسند ہے، لیکن حکیم مومن خاں کے شاعرانہ اسلوب کی تعریف نہ کرنا بہت بے جابات ہے اور مرزا نوشہ بے شک دُون کی لیتے ہیں لیکن ان کا انداز بیان واقعی دلکش اور یکتا ہے،

نواب نیر: میاں عارف مشاعرہ کرنے کی سوچ رہے ہیں، پانی پت کے ایک مولوی صاحب کریم الدین نامی چاہتے ہیں کہ دلی میں ایک ایسا مشاعرہ ہو جس میں سب استادانِ فن جمع ہوں۔

مفتی صاحب: ہاں، عارف نے مرزا فخرو کو بھی اِس مشاعرے کی شرکت کے لیے راضی کر لیا۔

نواب نیّر: بھئی یہ تو جی چاہتا ہے کہ سُلجھے ہوئے مذاق کے لوگ ایک جگہ جمع ہوں، بزم شعر و سخن آراستہ ہو، اور عارف سے اُمیّد ہے کہ وہ اچھا انتظام کریں گے۔

صہبائی: منشی فیض پارسا کے یہاں تو حکیم آغا جان عیش کے ہُد ہُد کی بدولت وہ ہنگامہ ہوا کہ مشاعرہ خاصا دنگل بن گیا۔ میں تو جا کر پچھتایا۔

نواب نیّر: جی ہاں یہ غنیمت سمجھیے کہ ردیف "تیلیاں" تھی اگر لکڑیاں ہوتی تو کُشتوں کے پشتے لگ جاتے۔

شیفتہ: میں اس مشاعرے سے ایک دن پہلے میرٹھ ایک ضروری کام سے چلا گیا اور اس کا افسوس تھا کہ شرکت نہ کرسکا۔ مگر اب یہ سُن کر ملال رفع ہو گیا۔ حکیم مومن خاں کل فرما رہے تھے میں تو شہر کے کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کروں گا۔

میر مہدی مجروح: مرزا صاحب بھی بہت برہم ہیں، فرما رہے تھے کہ ان نا اہلوں کو اپنے شعر اب میں بالکل نہیں سنانا چاہتا جو فنی اقدار سے واقف نہیں ہیں۔

نواب نیّر: سچ تو یہ ہے کہ مرزا صاحب کے کلام کو کم سواد لوگ اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے ورنہ ان کے بعض اشعار موتیوں میں تولنے کے لائق ہیں۔ کل ہی انھوں نے ایک غزل کہی ہے۔ کافی مشکل زمین ہے لیکن اتنے اچھے اچھے شعر کہے ہیں کہ مجھے بہت پسند آئی فوراً ولایت خاں کو یاد کرنے کو دیدی۔

میر مہدی مجروح: بھائی نیّر! یہ غزل اس وقت سنوایئے تو لطف آجائے گا۔

(نواب صاحب نے خدمتگار کو اشارہ کیا اور ولایت خاں نے

چند منٹ بعد حاضر ہو کر تمام حاضرین کو جھک کر مجرا کیا اور ادب سے دو زانو بیٹھ گیا۔ نواب صاحب نے کہا "ہاں ولایت خاں میرزا صاحب کی وہی غزل سناؤ جو کل شام ہم نے تم کو دی تھی۔" ولایت خاں نے "بہت بہتر سرکار" کہہ کر ستار کے تار چھیڑ کر کچھ دیر تک سُر درست کرنے کے بعد سوز بھری آواز میں مطلع گایا۔

نکتہ چیں ہے، غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

پہلے شعر پر ہی سب حاضرین جھوم اٹھے ہر طرف سے واہ واہ اور مرحبا کی آواز آئی۔ ولایت خاں نے آواز کھینچ کر دلکش انداز سے کہا۔

میں بلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

اِس شعر پر شیفتہ نے کہا واہ کیا خوب فرمایا ہے۔ "اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے۔"
ولایت خاں نے تیسرا شعر پر کیف انداز سے گایا۔

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

نیّر: جزاک اللہ غالب، یہ طرزِ ادا اور کس کو نصیب ہے۔
مجروح: (شعر دوہرا کر) ہائے کتنا بے ساختہ پن ہے اور کیسا تیکھا انداز!
ولایت خاں دلکش انداز سے تان مارتا ہے۔

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

واہ واہ کا شور پھر بلند ہوتا ہے۔

ولایت خاں دھیمے سروں میں کہتا ہے۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے

پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

مفتی صاحب: بہت جوش بھرے لہجے میں واہ میاں خوب۔ کتنا بلند خیال ہے اور کیسا اچھوتا انداز۔

پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

ولایت خاں۔ حُزنیہ انداز سے گاتا ہے۔

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے؟

تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

سب حاضرین پر عالمِ کیف طاری ہے سب جھوم رہے ہیں فضا پر ایک دل آویز سکوت چھایا ہوا ہے۔

ولایت خاں دلنشیں لہجے میں کہتا ہے۔

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے

کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

میرن صاحب: (طنزیہ انداز سے) واہ مرزا صاحب کیا کہنے ہیں، کس قدر بے معنی شعر کہا ہے لیکن عقیدت مند ہیں کہ ان کی اس بے تکی بانک پر بھی جھوم رہے ہیں۔ اب بھلا آپ ہی فرمائیے جو بوجھ سر سے گرنے کے بعد اٹھا کر سر پر نہیں رکھا جا سکتا وہ پہلے ہی کیسے سر پر آ گیا تھا کیا فضول بات ہے میری سمجھ میں تو آیا نہیں آپ حضرات سخن گو اور سخن فہم ہیں مجھے سمجھا دیں۔

نواب نیّر: خیر سمجھ تو ہم بھی سکتے ہیں لیکن اچھا ہے کہ حضرت غالب سے اس کی تشریح کرائی جائے۔

میر مہدی مجروح: تو میں پوچھ آؤں؟

نیّر: نہیں بھائی آپ بیٹھیے (اپنے بڑے لڑکے مرزا شہاب الدین ثاقب سے کہتے ہیں) شابو میاں! جاؤ مرزا صاحب سے ہم سب کا سلام عرض کرنا اور میر صاحب کی جانب سے یہ گزارش کرنا کہ اس شعر کا مطلب سمجھا دیں

(ثاقب مرزا غالب کے پاس حاضر ہوتے ہیں مرزا صاحب اس وقت ایک جام پی چکے ہیں دوسرا ہاتھ میں ہے اور عالم کیف و سرور میں اس غزل کا مقطع گنگنا رہے ہیں۔)

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

قدموں کی آہٹ پر چونک کر مرزا صاحب نے دیکھا اور محبت بھرے لہجے میں کہا آؤ بیٹا۔

ثاقب آداب کر کے ادب سے میرن صاحب نے جو کہا تھا۔ دوہرایا۔ مرزا صاحب قہقہہ لگا کر بولے ارے اس کنجوس سے کہدینا تو نکات و رموزِ شعر کیا جانے روپے جمع کرنے کے طریقے سیکھ استادانِ فن کے منہ آنے کی کیا ضرورت ہے اور شعر و شاعری سے تیرا کیا واسطہ ہے۔ ارے بیوقوف یوں سمجھ تلین تیل لیے جا رہا ہے تیل کی بھری ہوئی مٹکی سر پر رکھی ہے ٹھوکر لگی پاؤں پھسلا وہ گرا مٹکی ٹوٹ گئی۔ تیل بہہ گیا اب وہ اس تیل کو سر پر کیسے رکھے۔

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے

کنور محمد اشرف

حیاتِ غالبؔ کے چار منظر

(۱)

(دہلی میں غدر ۱۸۵۷ء سے کوئی ۱۵ سال پہلے۔ صبح کا وقت)

راوی: غالب اپنی عالیشان حویلی میں خوش نظر آتے ہیں۔ دیوان خانے میں بیٹھے گنگنا رہے ہیں۔

غالب: غالب از خاک پاک تورانیم — لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی — بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعت اتراک — در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فن آبائے ما کشاورزیست — مرزبان زادۂ سمرقندیم
در ز معنی سخن گزاردۂ — خود چہ گوئیم تا چہ و چندیم
فیض حق را کمینہ شاگردیم — عقل کل را بہینہ فرزندیم
ہم بہ تابش بہ برق ہم نفسیم — ہم بہ بخشش برابر ماندیم
بہ نگاشے کہ ہست فیروزیم — بہ معاشے کہ نیست خرسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمی گرییم — ہمہ بر روزگار می خندیم

راوی: اتنے میں نہ جانے کیا خیال آیا کہ میر مہدی کو خط لکھنے لگے۔

غالب: "مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں بہت خوش ہیں پچاس ساٹھ جز کی کتاب 'امیر حمزہ کی داستان' کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد 'بوستان خیال' کی ہاتھ آ گئی ہے سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشہ خانہ میں موجود ہیں دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں رات بھر شراب پیا کرتے ہیں:

کسے کیں مرادش میسر شود　　اگر جم نہ باشد سکندر بود

راوی: خط ختم نہ ہوا تھا کہ ہرگوپال تفتہ آن پہنچے۔

تفتہ: کہیے قبلہ یہ حویلی میں نئی تعمیر کیا ہو رہی ہے۔

غالب: میاں تعمیر کیا، نے دے کر آنے جانے کا ایک راستہ ہے سو وہ بھی دیوان خانے میں ہو کر۔ یہ سمجھ کر خلوت خانہ کو محلسرا بنایا چاہتا تھا کہ گاڑی، ڈولی، بہیل، کاہن، تیلن، تنبولن کہاری، ان فرقوں کا وہ دروازہ رہے گا میری اور میرے بچوں کی آمد و رفت دیوان خانہ میں سے رہے گی۔ عیاذاً باللہ وہ لوگ دیوان خانہ میں سے آئیں جائیں، اپنے بیگانے کو ہر وقت کھیل پائیں کیا آئیں یہ تو ہوتا رہے گا مگر پہلے اپنی اور دوستوں کی خیر و عافیت تو سناؤ۔

تفتہ: کوئی خاص بات نہیں آپ نے امراؤ سنگھ کا حال تو میرے خط میں پڑھ ہی لیا ہوگا اب ہمارے مرزا پر یہ مصیبت آئی ہے۔ جب سے چنا جان مری ہیں انہیں ایک دم کے لیے صبر و قرار نہیں۔ صبح شام جب دیکھو آہ و زاری اور چنا جان کی یاد۔ میرا تو خیال ہے کہ آپ انہیں خط لکھیں۔

غالب: عزیزم، میں نے تمہیں بھی لکھا تھا کہ امراؤ سنگھ کو سمجھاؤ وہ شادی کی بلا میں کیوں پھنستا ہے ایسا ہی ہے تو اس کے بچوں کو میں پال لوں گا مرزا جوان آدمی اور پھر غم کرے ایک ڈومنی کے مرنے کا چنا جان جیسی ہزاراں پر

قربان ہوں۔ ابھی لکھتا ہوں تم بھی سنتے جاؤ ـــــ

"ـــــ مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں ـــــ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے کیسی اشک افشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی ـــــ آزادی کا شکر بجالاؤ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسی ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی مناجان سہی ـــــ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ

زن نو کن اے دوست در نو بہار — کہ تقویم پارینہ ناید بکار"

تفتہ: مگر قبلہ نہ وہ آپ کی نوجوانی کی محبوبہ اور وہ مرثیہ جو جانکاہی میں عارف کے مرثیے سے کم نہیں ہے، یاد کیجئے:

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے

غالب: مگر عزیزم! اول تو وہ جوانی دوانی کا معاملہ تھا پھر مقطع پر بھی تو غور نہ کیا ہوتا،

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا دل میں تھا جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے

تفتہ: تو پھر یہ کیوں نہ کہیے کہ ذوق خواری ابھی باقی ہے۔ مگر قبلہ یہ تو بتائیے کہ گزارہ کی کیا صورت ہے۔ اب تو یہ صورت نہیں ہے کہ کبھی متھرا داس سے قرض لے لیا کبھی دربار ی لال کو جا مارا روٹی کا خرچ بالکل بھوپ کے سر۔ عام اخراجات کے لیے کبھی احمد بخش خاں سے کبھی الور سے ورنہ ماں سے کچھ نہ کچھ مل گیا۔ اب تو تمسکی قرض ہوگا اور قرض خواہوں کے تقاضے اس پر آپ کی شاہ خرچی میں بھلا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

غالب: مرزا تفتہ تم سے کیا چھپاؤں ڈگری داروں سے چھپتا پھرتا ہوں سواری میں نکلنا چھوڑا گھر میں بند ہوں اور یوں ہی پوچھتے ہو تو ناسخ کے نام

میرا فارسی خط پڑھ لو:

"نخستیں شرارہ کہ در خرمن صبر و ثبات می زدند آں بود کہ دوتن از گروہ وام طلباں ــــ ڈگری بہ حق من از عدالت حاصل کردند چوں فرجام آنست کہ یا زر مندرجہ ڈگری گزاردہ شود یا تن بہ بند و زنداں دادہ آید ــــ آرے از بہر نام آوراں ایں قدر ہست کہ سرہنگ عدالت بر کاشانہ شاں نتواند تاخت تا خود بہ رہگذر یافتہ نشوند بہ اسیرے نہ روند، چوں گنجائش ادائے زر نبود لاجرم بہ پاس آبرو خود را گرد آوردم و ترک نشاط سواری کردم ــــ"

تفتہ: اگر میری مانو تو سرکار انگریزی کی کوئی ملازمت کر لو اس سے آئے دن کی امیروں اور نوابوں کی قصیدہ خوانی سے نجات مل جائے گی اور اگر "فتوح" بھی مل ہو جائیں تو اللہم زد فزد۔

غالب: بھائی ملازمت سے یہاں کس کو انکار ہے مگر کوئی ملازم رکھے بھی! پچھلے مہینے کی بات ہے کہ دہلی کالج میں فارسی مدرس کی مانگ ہوئی اور امیدواروں میں مجھے بھی بلایا گیا چنانچہ میں پالکی میں سوار ہو ٹامسن صاحب کے ڈیرے پر پہنچا مگر اوّل تو وہ مجھے لینے نہیں آئے اور جب بالآخر دیر کے بعد آئے تو فرمانے لگے کہ اس وقت چونکہ آپ نوکری کے لیے آئے ہیں وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا جو دربار کے وقت ہوتا ہے۔ اب عزیزم تمہیں سوچو کہ ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا تھا کہ اس سے اعزاز کچھ بڑھے گا نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے، غرضیکہ میں خدمت سے معذرت کر کے چلا آیا، تمہیں معلوم ہے کہ رؤسا سے میرے تعلقات برادرانہ ہیں۔

راوی : مرزا تفتہ اور غالب کی یہ نجی گفتگو ابھی جاری تھی کہ علاء الدین خاں، حمزہ خاں ایک دوسرے دوست کو لیے آپہنچے اور اب خاص مجلس منعقد ہو گئی۔

غالب : کہو میاں علاء الدین تمہارے دم سے تو سب خیر بینہ ہے۔ میاں نیر تو اچھے ہیں اخاہ! مولوی حمزہ خاں صاحب آپ کے مزاج تو بخیر ہیں مصلی چھوڑ کر ادھر رمضان میں کہاں آنکلے اور آپ کی تعریف! میری آپ سے غالباً پہلے ملاقات نہ ہوئی۔

علاء الدین خاں : مرزا صاحب! یہ میرے عزیز دوست امیر محمد خاں صاحب ہیں فارسی شعر و سخن کا بڑا اچھا مذاق رکھتے ہیں۔ آپ سے ملنے کے زمانے سے مشتاق تھے بلکہ قتیل والی نزاعی بحثوں میں آپ کے ہمنوا اور حامی رہے ہیں میں آج انہیں آپ سے ملانے لے آیا۔

غالب : مگر ان کا اور حمزہ خاں کا کیا جوڑ ہے؟ فرمائیے کچھ شراب حاضر کروں؟

حمزہ خاں : مرزا صاحب شراب اور پھر ماہ صیام میں! کچھ شرماؤ یہ گناہ کبیرہ ہے۔

غالب : (ہنس کر) اور جو کوئی رمضان میں پیے تو کیا ہوتا ہے؟

حمزہ خاں : ادنیٰ بات یہ ہے کہ دعا قبول نہیں ہوتی۔

غالب : آپ جانتے ہیں شراب پیتا کون ہے؟ اول تو وہ ایک بوتل اولڈ ٹام کی باسامان حاضر ہو۔ دوسرے بے فکری، تیسرے صحت آپ فرمائیے کہ جسے یہ سب کچھ حاصل ہو اسے اور کیا چاہیے جس کے لیے دعا کرے؟

حمزہ خاں (کھسیانے ہو کر) مگر جناب کے عقاید ویسے کون درست ہیں؟

غالب : (ناراضگی کے لہجے میں) دریبے کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور رسائل ابوحنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وجود کو اپنے دل نشیں

کرنا اور ہے میں ہزار بار پکار پکار کر کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ میں اللہ کو ایک اور رسول کو برحق جانتا ہوں۔

اب جو چاہے کہا کرے کوئی

علاءالدین خاں: (بیچ میں سے بات کاٹتے ہوئے) مرزا صاحب خدا رحم کرے عقائد کی بحث تو وہ ہے جس پر ہزار برس سے بحثیں جاری ہیں اور فریقین آج تک کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے ہیں اور امیر محمد خاں اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ خالص اللہ ممتاز اور اختر کے فارسی کلام کے بارے میں آپ کی رائے معلوم کریں۔

تفتہ: بیشتر اس کے کہ مرزا صاحب قبلہ نئے اسالیب کے بارے میں کچھ کہیں اور بحث شروع ہو میں، چاہتا ہوں کہ ناظم ہروی صاحب کا ایک قطعہ آپ صاحبان کو سنا دوں ممکن ہے کچھ بحث میں بھی مدد دے کہتا ہے:

شنیدم کہ در دورگاہ کہن — شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی — بہ فردوسی آمد کلاہ مہی
چو فردوسی آورد سر در کفن — بہ خاقانی آمد بساط سخن
چو خاقانی از دار فانی گذشت — نظامی بہ ملک سخن شاہ گشت
نظامی چو جام اجل در کشید — سر چتر دانش بہ سعدی رسید
چو اورنگ سعدی فرو شد ز کار — سخن گشت بر فرق خسرو نثار
ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید — ز جامی سخن را تمامی رسید

غالب: مگر تفتہ! ابھی تمامی کہاں، مقطع تو چھوڑ ہی گئے اسے اور بڑھا دو:

ز جامی بہ عرفی و طالب رسید — ز عرفی و طالب بہ غالب رسید

امیر محمد خاں: مرزا صاحب! ہے تو سوئے ادب مگر مجھے اس میں خودستائی کی بو

آتی ہے آپ نے ایک بار بہادر شاہ کے مدحیہ قصیدہ میں بھی اسی طرح ایک جگہ فرمایا تھا:

امروز من نظامی و خاقانیم بدہر | دہلی زمن بہ گنجہ و شروان برابرست
سلجوقیم بہ گوہر و خاقانیم بہ فن | تو قیع من بہ سنجر و خاقاں برابرست

غالب: ظاہر ہے کہ قصیدہ میں شاعرانہ تعلّی کی گنجایش ہوتی ہے اور یہ عیب نہیں ہے مگر میں نے خود ایک مثنوی لکھنا شروع کی ہے اور شروع ہی میں اس کا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ میں کسب فیض اساتذۂ کرام سے کرتا ہوں سنیے میں نے اس کے مقدمے میں لکھا ہے۔

"بدیں استخواں پیکر کہ بر اسداللہ غالب نامور است ـ بہ ریزش نمک طرز عرفی شیرازی و آمیزش شکر ادائے نظیری نیشاپوری شور انگیزی دگلو سوزی حسن بہ رشتۂ آں شاہد عجبی افزوند غزل و قصیدۂ و رباعی را درمزجام کشی و دلکشی لفظ و معنی کار ازاں گذشت کہ دیگرے را درانداشیہ گزرد بہ سیج نبشتن مثنوی و دل نشیں افتاد۔ فردوسی طوسی را بہ رہنمائی و نظامی گنجوی را بہ نیرو فزائی گماشتند"

غالباً اس کے بعد خود پرستی اور خود ستائی کا الزام مجھ پر عائد نہ ہوگا۔

امیر محمد خاں: اصل میں میرا خیال سید احمد خاں صاحب کی اس تحریر کی طرف گیا جہاں انھوں نے آپ کو اساتذہ سے بھی بلند مرتبہ دیا ہے مگر خیر اس فضول بحث کو چھوڑیے اور کوئی غزل سنائیے۔

غالب: غزل تو شاید کوئی مشکل سے یاد آئے کہیے تو چیدہ چیدہ اشعار سنادوں۔

امیر محمد خاں: مرزا صاحب وہی سنا دیجیے جس کا پہلا مصرع ہے:

"تا بم ز دل برد کافر ادائے"

غالب : یہ غزل خود اس کا ثبوت ہے کہ میں اساتذۂ فن کا تتبع کرتا ہوں ملاحظہ ہو :

تا ہم ز دل بردکا فرادائے | بالا بلندے کوتہ قبائے
چوں مرگ ناگہ بسیار تلخے | چوں جان شیریں اندک وفائے
در کام بخشی ممسک امیرے | در دل ستانی مبرم گدائے
گستاخ سانہ پوزش ایندے | طاقت گدازے صبر آزمائے
از خوئے ناخوش دوزخ نہیبے | وز روئے دلکش مینولقائے
زردشت کیشے آتش پرستے | برسم گزارے زمزم سرائے
در کینہ ورزی تفسیدہ دشتے | در مہربانی بستاں سرائے
از زلف پر خم مشکیں نقابے | از تابش تن زریں ردائے

در عرض دعوئے لیلیٰ نکوہے
بر زعم غالب مجنوں ستائے

امیر محمد خاں : سبحان اللہ مرزا صاحب کیا خوب کہا ہے آپ کا دعویٰ خود ستائی نہیں حق بجانب ہے خدا آپ کا سایہ ہم جیسے نو آموزوں پہ قائم رکھے ۔

لفٹنہ : صاحبو وہ مطبخ سے وفادار ماما آرہی ہے معلوم ہوتا ہے کہ قبلہ مرزا صاحب کا کھانے پر اندر انتظار ہو رہا ہے اس لیے اب یہ مجلس برخاست ہو تو اچھا ہے ۔

راوی : لوگ آداب کے بعد رخصت ہوتے ہیں ۔

(۲)

(دہلی میں غدر ۱۸۵۷ء سے کوئی ۳ سال پہلے)

راوی: غالب اب فقط میرزا نوشہ نہیں بلکہ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے شاہی خطاب سے یاد کیے جاتے ہیں آج مہر نیم روز اور ایک مدحیہ قطعہ لیکر قلعہ معلی جانے کی تیاری کر رہے ہیں کہ اتنے میں میر مہدی دیوان خانے میں داخل ہوتے ہیں۔

میر مہدی: قبلہ تسلیمات عرض کرتا ہوں۔

غالب: جیتے رہو عزیزم، عمر دراز ہو ــــ مگر میں تو لال قلعہ جا رہا ہوں پالکی تیار ہے۔

میر مہدی: میں صرف یہ عرض کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا کہ سیٹھ جی کسی طرح ڈگری کے اجرا کو ملتوی کرنے کے لیے رضا مند نہیں ہوتے۔ میں نے لاکھ سمجھایا منتیں کیں لیکن وہ نہیں مانے۔

غالب: میاں! یہی تو باعث ہے میرے فوراً قلعہ معلی جانے کا میں نے مہر نیم روز کے مقدمہ میں اپنی ناداری کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ لو یہ حصہ سنو:

"گویند در عہد جہانبانی حضرت صاحبقران ثانی بہ فرمان آں خسرو دریا دل کلیم را صدرہ بہ سیم و زر و لعل و گہر سختہ اند من آں خواہم کہ دیوزوراں را دستوری دہی تا از کشمش و کوشش نہ رنجند دیک بارگفتار مرا با کلیم بہ سنجند ــــ"

میر مہدی: قبلہ! ان اشاروں کنایوں سے کہیں کام چلتا ہے ذرا کھل کر کہا ہوتا۔

غالب: بھائی ریختہ کے مدحیہ و عرض حالیہ قطعہ میں کھل کر نہیں بلکہ منہ پھٹ

ہو کر عرض مدعا کیا ہے۔

میر مہدی: ہاں اگر دو ٹوک بات کہی گئی ہے تو ٹھیک ہے اچھا تو پھر تشریف لے جائیے اور قسمت آزمائی کر دیکھیے۔

راوی: غرض کہ مہر نیم روز کا نسخہ اور قطعہ لے کر غالب لال قلعہ پہنچے پیشی ہوئی حضرت بہادر شاہ نے مہر نیم روز پسند فرمائی اور کتابت کے لیے ارشاد ہوا قطعہ سنا کچھ دیر تک چپ رہے۔

بہادر شاہ: (آب دیدہ ہو کر) مرزا نوشہ میں نے اسے تا حال پوشیدہ رکھا تھا مگر اب سن لو کہ پچھلے مہینے انگریزی سرکار نے فیصلہ کیا ہے کہ میرے بعد بادشاہ کا خطاب موقوف ہو جائے گا اور خاندان شاہی کو قلعہ معلیٰ میں رہنے کی اجازت نہ ہوگی۔ (آہ سرد بھر کر)

اے ظفر باقی ہے تجھ سے انتظام سلطنت
بعد تیرے نے ولی عہد و نہ نام سلطنت

مگر خیر تو میری تازہ غزل سن لو، استاد ذوق کو پسند آئی ہے:

سب کارِ جہاں ہیچ ہیں سب کارِ جہاں ہیچ — اس ہیچ سے اُمید ہے لے ہیچداں ہیچ
جن ناموروں کے کہ جہاں زیرِ نگیں تھا — اب ڈھونڈیئے تو ان کا کہیں نام و نشاں ہیچ
ہو جنس تنک مایہ ہستی کے نہ خواہاں — یہ جنس یہ بازار یہ گوہر یہ دکاں ہیچ
جو ہونی ہے ہوگی نہیں امکاں کہ نہ ہووے — پھر فکر سے کیا فائدہ غیر از خفقاں ہیچ

کیا دیکھیں ظفر خانۂ ہستی کا تماشا
اس وہم کدہ میں ہے بجز وہم و گماں ہیچ

غالب: پیر و مرشد سبحان اللہ خوب ہے مگر یاس انگیزی لیے ہوئے ہے۔

بہادر شاہ ظفر: مرزا نوشہ کبھی تم پر بھی ایسا وقت گزرا ہے اور تم نے ان لمحوں

میں شعر کہے ہیں۔

غالب: مرشد، میں ناچیز، ہیچمیز، اس لائق کہاں ہوں کہ کوئی اچھا شعر کہوں البتہ چھ سات برس پہلے مجھے زنداں لے گئے تھے تو میں نے ایک "حبسیہ" لکھا تھا اگر اجازت ہو تو سنا دوں ؟

بہادر شاہ ظفر: ہاں مرزا نوشہ ضرور افسوس کہ اس وقت استاد موجود نہیں ہیں جو داد دیتے۔

غالب: شروع میں کہا ہے:

خواہم از بند بہ زنداں سخن آغاز کنم　　غم دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم

ایک شعر ہے:

بے مشقت نہ بود قید بہ شعر آدیزم　　روز کے چند رسن تابی آواز کنم
اہلِ زنداں بسرو چشم خودم جا دادند　　تا بدیں صدر نشینی چہ قدر ناز کنم

ایک بعد کا بند اس طرح شروع ہوتا ہے:

پاسبانان بہم آئید کہ من می آیم　　در زنداں بکشائید کہ من می آیم
ہر کہ دیدے بہ درخویش سپاہم گفتے　　خیر مقدم بہ سرائید کہ من می آیم

بہادر شاہ ظفر: مرزا تمہاری شوخی ظرافت اور خوش دلی یہاں بھی نہ گئی، میرا مضمون دوسرا ہے۔

غالب: مگر سرکار آخری شعر اور سن لیجے عرض کیا ہے:

شادم از قید کہ از بند معاش آزادم　　از کف شحنہ رسد جامہ و نانم ایں جا

بہادر شاہ ظفر: ہاں مرزا میں مطلب سمجھا سوچوں گا مگر بھئی کریم الدین کے مشاعرے میں ضرور آنا خدا معلوم کہ پھر دوبارہ مشاعرہ ہو کہ نہ ہو میں بھی اپنی غزل بھیجوں گا، مرزا فخرو خود شریک ہوں گے۔ اور اب کی بار پچھلے مشاعروں جلیسا

ہلڑ نہ ہوگا یہ اور اچھا ہے کہ مصرع طرح کوئی نہیں۔

غالب: پیرو مرشد جب حضور غزل بھیج رہے ہیں اور استاد ذوق اور مومن شریک ہو رہے ہیں۔ تو اس حقیر کی کیا مجال کہ ارشاد عالی بسرو چشم نہ بجا لائے۔

راوی: غرض کہ غالب لال قلعہ سے خالی ہاتھ اور اداس ہی لوٹے حویلی میں آئے تو ایک دوست کا خط ملا جس میں انھوں نے خیریت اور حال پوچھا تھا کھانا تیار تھا مگر پہلے جواب کا رقعہ لکھ کر کلیان کے حوالے کیا تاکہ ڈاک میں ڈال آئے لکھا تھا۔

"مجھ کو دیکھو نہ آزاد ہوں نہ مقید نہ رنجور ہوں نہ تندرست نہ خوش ہوں نہ ناخوش، نہ مردہ ہوں نہ زندہ، جیے جاتا ہوں، باتیں کیے جاتا ہوں، روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں، جب موت آئے گی مر بھی رہوں گا نہ شکر ہے نہ شکایت ہے، جو تقریر ہے بر سبیل حکایت ہے"

سہ پہر کو غالب قیلولہ کر کے دیوان خانہ میں آئے ہی تھے کہ میر مہدی اور تفتہ استاد کو مشاعرے میں لے جانے کے لیے آ پہنچے۔ غالب لال قلعہ ہی میں وعدہ کر آئے تھے سوچا کہ جی بہل جائے گا دونوں شاگردوں کو ہمراہ لے چل دیئے مشاعرہ کا اہتمام نام کو میاں کریم الدین کے سر مگر دراصل زین العابدین خاں کے ذمہ تھا، چنانچہ فرش فروش آؤ بھگت، ساز و سامان کسی چیز میں کوئی کمی نہ تھی اور پہلی بار شہر کے اشراف اور اساتذہ کرام بڑی متانت سے باسلیقہ بیٹھے ہوئے تھے۔ دستور کے مطابق پہلے بہادر شاہ ظفر اور پھر ولی عہد بہادر کی غزل پڑھ کر سنائی گئی۔ اس کے بعد مشاعرہ

شروع ہوا جس میں پہلے نوجوان شاعروں کا نمبر آیا نوجوانوں میں ایک فرانسیسی نژاد الیگزنڈر آزاد اور ایک ہندوستانی عیسائی، جارج اسپیس شور بھی تھے۔ نازنین نے اپنے خاص انداز میں ریختی پڑھی نوجوانوں کے بعد استادوں کی باری آئی اور ان میں بھی غالب کی تقریباً سب کے بعد۔

غالب: ابن مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

راوی: اس مشاعرے میں قابل ذکر منشی محمد علی تشنہ بھی ہیں یہ ننگ دھڑنگ۔ دوزانو بیٹھے جھوم رہے تھے کہ چوبدار نے لا کر شمع ان کے سامنے رکھ دی جب آنکھوں میں روشنی پڑی تو میاں تشنہ نے پھونک مار کر شمع گل کر دی اور کہا ـــــ

تشنہ: میں بھی کچھ عرض کروں۔

حاضرین: فرمائیے!

تشنہ: (نہایت آزادانہ لہجے میں گاتے ہوئے)

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے — سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں
شمع ہے گل بھی ہے بلبل بھی ہے پروانہ بھی — رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں
حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے — فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں
نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش — سیر کرتا ہوں ادھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں

ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ
فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

راوی: غزل کا مضمون، آدھی رات کی کیفیت، پڑھنے والے کی حالت غرض یہ

معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے ادھر یہ عالم طاری تھا ادھر میاں تشنہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے اور "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کہتے ہوئے اٹھے اور اسی عالم بے خودی میں دروازہ سے باہر نکل گئے ان کی "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کی آواز بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی ذرا طبیعتیں سنبھلیں تو سب کے منھ سے بے اختیار یہی نکلا کہ "واقعی کچھ بھی نہیں ــــــ"

(۳)

دہلی میں ــــــ زمانۂ غدر، ۱۸۵۷ء

راوی: میرٹھ سے باغی سپاہیوں کی آمد کے کچھ دن بعد غالب کوچہ قاسم جان میں دروازہ بند کیے بیٹھے ہیں کہ ایک آدمی دستک دیتا ہے اور مرزا ہرگوپال تفتہ کا رقعہ دے کر جواب کا منتظر ہے۔ تفتہ نے اپنے رقعہ میں لکھا ہے:

"مدت سے خیر و عافیت کا طالب ہوں دو حرف اگر لکھ دیں تو اطمینان ہو جائے۔"

غالب جواب میں لکھتے ہیں:

"عزیزم مرزا تفتہ، انگریزوں کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھوں سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ کوئی میرا شفیق کوئی میرا دوست کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد ہندوستانیوں میں کچھ عزیز کچھ دوست کچھ شاگرد اور کچھ معشوق سو وہ سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔
موت کا طالب غالب۔"

اور پھر تحفہ کے فرستادہ کے حوالے کر دیتے ہیں۔
چند ماہ بعد جب انگریزی فوج شہر میں داخل ہوئی تو قتل و غارت کا بازار اور بھی گرم ہوا۔ خیر سے پٹیالے کے سپاہیوں نے غالب کے محلے کی حفاظت کا ذمہ لے لیا اور غالب دستنبو کی ترتیب میں لگے رہے ایک دن اسی کام میں مصروف تھے کہ ٹھاکر امید سنگھ پوچھتے پاچھتے اندر داخل ہوئے۔

امید سنگھ: مرزا صاحب بندگی بجالاتا ہوں۔

غالب: آیئے آیئے ٹھاکر صاحب کہاں آنکلے میں تو مہینوں سے آپ کے خط کا منتظر تھا۔

امید سنگھ: میں ایک کام سے آگرہ آیا تھا مگر جب معلوم ہوا کہ انگریزی فوج نے دہلی پر قبضہ کر لیا ہے تو خیال ہوا کہ آپ کا حال معلوم کر لوں کہ کیسی گزری کہیے بسر اوقات کیسے ہے؟

غالب: بسر اوقات! آپ نے بھی ایک ہی کہی بھائی نقدی زیور ایک دوست کے گھر رکھوا دیا تھا وہ لٹ گیا اس کے بعد برتن بھانڈے بیچ کر گزارہ کیا، اب کپڑوں کی باری ہے لوگ روٹی کھاتے ہیں اور میں کپڑا کھاتا ہوں ایک پیسے کی آمد نہیں بیس آدمی روٹی کھلانے والے موجود۔

امید سنگھ: تو پھر آئندہ کیا ہوگا۔

غالب: آئندہ؟ دستنبو کے خاتمہ پر اسی کے بارے میں لکھ رہا تھا اسے سن لو:
"جو حالت کہ اس وقت در پیش ہے اس کا انجام یا موت ہے یا بھیک مانگنا پہلی صورت میں یقیناً یہ داستان نا تمام رہنے والی ہے اور دوسری صورت میں نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ کسی دکان سے دھتکارے گئے اور کسی دروازہ سے کوڑی پیسہ کچھ مل گیا بس اپنی ذلت اور رسوائی۔

کے سوا اب اس میں کچھ لکھنے کو باقی نہیں رہا۔"

امید سنگھ: خدا نہ کرے مرزا صاحب آپ کے دشمنوں کو یہ دن دیکھنا نصیب ہوں مگر یہ تو فرمایئے کہ آپ کا کلام تو محفوظ ہے اس قتل و غارت میں کہیں اس پر تو کوئی مصیبت نہیں آئی۔

غالب: میں نے جو کچھ نظم و نثر میں لکھا تھا وہ سب بھائی ضیاء الدین خاں نے جمع کیا تھا بلکہ کلیات فارسی پنج آہنگ مہر نیم روز اور دیوان ریختہ کی سنہری جلدیں بنوائی تھیں پھر ان سے لے کر ایک شہزادے نے اس کی نقل کرائی مگر یہ دونوں کتب خانے اسی ہنگامے میں لٹ گئے اور میں دوستوں سے منت سماجت کر رہا ہوں کہ بھائی اگر کہیں یہ نسخے بکتے نظر آئیں تو ان کو میرے واسطے خرید لینا مگر اس انتشار و ابتری میں ہوش کسے ہے۔

امید سنگھ: تو انگریزی فوجی بھی اس لوٹ اور غارت گری میں شریک تھے۔

غالب: (ایک پرزہ جیب سے نکال دیتے ہوئے) یہ شعر پڑھ لو مگر کسی سے ذکر نہ کرنا۔

بس کہ فعّال ما یرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

راوی: ابھی غالب نے شعر ختم بھی نہیں کیے تھے کہ دروازہ پر دستک ہوئی اور ایک گورا مکان کے اندر داخل ہوا۔

گورا: اسد اللہ کون؟ کرنل ان کو مانگتا۔

راوی: ٹھاکر امید سنگھ کو رخصت کر کے غالب گورے کے ساتھ کرنل براؤن کی پیشی میں پہنچے۔

کرنل براؤن: ویل! تم مسلمان آدمی ہے۔

غالب: حضور آدھا۔

کرنل براؤن: اس کا کیا مطلب؟

غالب: (وزیر ہند کی چٹھی دکھاتے ہوئے) حضور شراب پیتا ہوں سؤر نہیں کھاتا۔

کرنل براؤن: (ہنس کر) تم سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر سلامی کے لیے کیوں حاضر نہیں ہوئے۔

غالب: حضور میں چار کہاروں کا افسر تھا وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے ایسی صورت میں میں حاضری دیتا تو کیونکر؟

کرنل براؤن: مرزا صاحب ہم کو آپکی وفاداری پر بھروسہ ہے آپ جا سکتے ہیں۔

راوی: ماہ دو ماہ بعد دہلی میں امن قائم ہو گیا یعنی صدہا لوگوں کی جائدادیں ضبط ہوئیں ہزاروں مارے گئے اور دہلی ویران نظر آنے لگی اسی زمانے میں ایک دوست نے غالب سے پوچھا۔

ایک دوست: حامد علی خاں کی حویلی سنا ہے کہ نیلام ہو گئی آپ نے تو ندرائے سے مرافعہ کیوں نہ کرایا۔

غالب: مکانات کو حامد علی خاں کا کر کر کیوں کہتے ہو وہ تو مدت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہو گیا۔ سنگ و خشت کا نیلام کم کے روپیہ داخل خزانہ ہوا۔ جب بادشاہ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کو کون پوچھتا

ہے تم اب تک سمجھے نہیں کہ حکام کیا سمجھتے ہیں اور نہ کبھی سمجھو گے۔ کیسا لونڈرا ئے کیسی نقل حکم، کیسا مرافعہ؟ جو احکام کہ دلّی میں صادر ہوئے ہیں وہ احکام قضا و قدر ہیں ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔

راوی: غالب ایک دن بیٹھے تھے کہ چٹھی رساں نے علاء الدین احمد خاں کا خط لاکر دیا انھوں نے لکھا تھا:

"قبلۂ محترم سنا ہے دلّی میں اب امن ہے آپ نے جو دستنبو کی جلد کے بارے میں فرمایا ہے میرا خیال ہے کہ اس کا اہتمام دلّی میں بہتر ہو سکے گا۔ آخر دلی عروس البلاد ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے ـــــ"

غالب اس پر جھلّا اٹھے اور فوراً جواب لکھنے بیٹھ گئے۔ لکھتے ہیں زور زور سے خود بھی پڑھتے جاتے ہیں۔

غالب: کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلّی بڑا شہر ہے ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے، اے میری جان یہ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے وہ دلّی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں وہ دلّی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں ایک کیمپ ہے اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود ـــــ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیہ السیف ہے وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں جو پیر زن ہیں وہ کٹنیاں اور جوانیں کسبیاں ـــــ شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں ہنر مند آدمی یہاں کیوں کر پایا جائے۔

راوی: مسلمان شرفا میں دلّی میں لے دیکر غالب سلطان جی میں مولوی صدر الدین خاں آزردہ اور میرٹھ میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رہ گئے تھے اور لوگ انہی سے بقیۃ السیف کا حال پوچھتے تھے کبھی کبھی غالب خود بھی اپنے تاثرات قلم بند کر دیتے تھے مرزا یوسف کو لکھتے ہیں۔

"یوسف مرزا! میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے، پوچھو کہ غم کیا ہیں غم مرگ، غم فراق، غم رزق —— یہاں اغنیا اور امراء کے ازواج اور اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں بس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے"۔

بالآخر غدر کے بعد غالب کی خستگی اس درجہ کو پہنچ گئی کہ نہ رہائشی مکان ڈھنگ کا رہا نہ گزارے کے لیے ہی کوئی سبیل تھی قرض پنشن سب بند۔ بس چند مدرد دوست اور شاگرد رہ گئے تھے جنہیں غالب کی ضروریات کا خیال رہتا تھا ایک دن اتفاق سے علاء الدین احمد خاں بھی آ نکلے۔

علاء الدین احمد خاں: پھوپا جان! اس مکان کی مرمت کا بھی کوئی انتظام ہے۔

غالب: میاں بڑی مصیبت میں ہوں، محلسرا کی دیواریں گر گئیں ہیں پا خانہ ڈھے گیا چھتیں ٹپک رہی ہیں تمہاری پھوپی کہتی ہیں ہائے دبی ہائے مری دیوانخانہ کا حال محلسرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں۔

علاء الدین احمد خاں: اور یہ خط کس کا ہے۔

غالب: منشی عبدالغفور کا۔ انہیں دہی رٹ ہے کہ قصیدہ کیوں نہیں لکھتے تمہارا

مرتبہ تو انوری اور خاقانی سے کم نہیں ہے۔ یہاں کھانے کو میسر نہیں قصیدہ کیا خاک لکھوں پنشن مل جائے حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ فکر کروں اس عسرت میں تو رباعیاں ہی لکھی جا سکتی ہیں چنانچہ کل ہی ایک کہی ہے نسق پہ محمول نہ ہو تو تمہیں بھی سنا دوں۔

علاء الدین احمد خاں: قبلہ میں تو آپ کا نیاز مند شاگرد ہوں ضرور ارشاد ہو۔

غالب: یارب تو کجائی کہ بما زر ندہی — بے درد خدائی کہ بما زر ندہی
نے نے تو غنی ونے بے رحمی — بے مایہ چو مائی کہ بما زر ندہی

علاء الدین احمد خاں: تو پھر آپ نے منشی عبدالغفور کو کیا جواب دیا، ان کا منشا یہ ہو گا کہ انگریزی حکام کی خوشنودی کے لیے قصیدہ کہیے۔ آخر اس میں عیب کیا ہے۔

غالب: میں نے منشی صاحب کو جو جواب لکھا ہے وہ تم بھی سن لو:

"کرم فرمائے بندہ — میں اموات میں ہوں، مردہ شعر کیا کہے غزل کا ڈھنگ بھول گیا معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آئے۔ رہا قصیدہ ممدوح کون ہے — گورمنٹ کے دربار میں میری طرف سے قصیدہ نذر گزرتا ہے۔ اشرفیاں نہیں اور خلعت ریاست دودمانی کا، ۷ پارچہ اور ۳ رقم جیغہ سرپیچ مالائے مروارید مجکو ملا کرتا ہے۔ اب نواب گورنر جنرل بہادر یہاں آئے ہیں، دربار میں بلائے جانے کی توقع نہیں، پھر کس دل سے قصیدہ لکھوں صناعت شعر اعضا و جوارح کا کام نہیں، دل چاہیے، دماغ چاہیے ذوق چاہیے، امنگ چاہیے یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں —"

راوی: بالآخر یہ سامان بھی دوبارہ فراہم ہو گئے یعنی کچھ مدت کے بعد غالب کے تعلقات حکومت برطانیہ سے خوشگوار ہو گئے اور جب دوبارہ منشی عبدالغفور نے غالب سے خیر و عافیت پوچھی تو مرزا نے لکھا:

"حقیقت میری مجملاً یہ ہے کہ راہ و رسم مراسلت حکام عالی مقام سے بدستور جاری ہو گئی ہے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کو نسخۂ دستنبو بہ سبیل ڈاک بھیجا تھا ان کا خط فارسی شعر تحسین عبارت و قبول صدق ارادت و مودت بہ سبیل ڈاک آگیا پھر قصیدہ بہاریہ تہنیت و مدحت میں بھیجا گیا اس کی بھی رسید آگئی وہی خان صاحب بسیار مہربان دوستاں القاب اور کاغذ افشانی۔ ازاں بعد ایک قصیدہ جناب رابرٹ مانٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب کی مدح میں بتوسط صاحب کمشنر بہادر دہلی گیا اس کے جواب میں بھی خوشنودی نامہ بتوسط کمشنر بہادر کل مجھ کو آگیا۔ پنشن اب تک مجھ کو نہیں ملی جب ملے گی حضرت کو اطلاع دی جائے گی ــــ"

بالآخر پنشن بھی مل گئی اور اب تعلقات حکام سے شگفتہ ہو گئے، ایسے شگفتہ کہ غالب ان کے احسان کا دم بھرنے لگے۔ تھوڑے دن بعد جب انھوں نے منشی عبدالغفور کو لکھا تو ایڈمنسٹن صاحب چیف سکریٹری کا ذکر خصوصیت سے کیا کہتے ہیں:

غالب: جناب ایڈمنسٹن صاحب بہادر سے میں صورت آشنا نہیں ــــ نامہ و پیام کی یوں بات ہے کہ جب کوئی نواب گورنر جنرل بہادر نئے آتے ہیں تو میری طرف سے ایک قصیدہ نذر جاتا ہے۔ ایڈمنسٹن صاحب بہادر چیف سکریٹری کا مجھ کو جو خط آیا تو انھوں نے باوجود عدم سابقہ معرفت میرا القاب بڑھایا

قبل ازیں "خان صاحب بسیار مہربان دوستاں" میرا القاب تھا اس قدر شناس نے از راہ قدر افزائی "خان صاحب مشفق بسیار مہربان مخلصاں" لکھا۔ اب فرمایئے ان کو کیونکر اپنا محسن اور مربی نہ جانوں کیا کافر ہوں جو احسان نہ مانوں۔

راوی: غرض کہ اب غالب کی شراب دوبارہ جاری ہوئی دوستوں اور شاگردوں کے پھر جھمگھٹے رہنے لگے۔ مگر اب مرزا بوڑھے ہو چلے تھے اور غدر کے حادثہ نے ویسے بھی انھیں بے دم کر دیا تھا۔ اس دور میں انھیں خیال آیا کہ شاہنامہ کے انداز میں مثنوی ابر گہر بار لکھیں تاکہ اسلامی فتوحات کی تاریخ اور مومنین کے لیے شاہنامہ کا کام دے مگر تھے بہر نوع عقل پرست صوفی اور مے پرست شاعر اپنی مے پرستی کا حوالہ دینا بھی مناسب سمجھا اور لطف یہ ہے کہ اس پر شرمساری اور ندامت کا گمان تک نہ ہو لے کہتے ہیں:

ہمانا تو دانی کہ کافر نیم — پرستار خورشید و آزر نیم
نہ کشتم کسے را بہ اہریمنی — نہ بردم ز کس مایہ در رہزنی
مگر مے کہ آتش بہ گورم ازوست — بہ ہنگام پرواز مورم ازوست
مے اندوہ گیں و مے اندوہ ربائے — چہ می کردم اے بندہ پرور خدائے
حساب مے و رامش و رنگ و بو — ز جمشید و بہرام و پرویز جو
نہ از من کہ از تاب مہ گاہ گاہ — بہ دریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستاں سرائے نہ مے خانہ — نہ دستاں سرائے نہ جانانہ

نہ رقص پری پیکراں بر بساط
نہ غوغائے رامشگراں در رباط

(۴)

دہلی میں ——————— غالب کی موت سے کچھ پہلے

راوی: بلّی ماروں کے محلّے میں کرایہ کے مکان میں میر مہدی اور شیو نرائن چارپائی کے پاس مونڈھوں پر بیٹھے ہیں غالب بستر مرگ پر پڑے گنگنا رہے ہیں۔

غالب: مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند
رخ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند
دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند
سوخت آتشکدہ ز آتش نفسم بخشیدند
ریخت بت خانہ ز ناقوس فغانم دادند
گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند
ہر چہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

میر مہدی: قبلہ آپ نے جو کہا اگر اس کا کوئی تعلق ہماری تہذیب و ادب کے مستقبل سے ہے تو کم از کم میں مایوس ہوں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شاہجہاں آباد اور لال قلعہ کے مٹنے کے بعد ہماری تہذیب کیسے سلامت رہ سکتی ہے اور اسے قائم کون اور کیسے رکھ سکتا ہے۔

غالب: میاں مہدی! کیا واقعی تم سمجھتے ہو کہ مغل بادشاہت میں رکھ رکھاؤ کے سوا کچھ رہ بھی گیا تھا۔ شاہ عالم کے بارے میں دلّی والے کہا کرتے تھے کہ "حکومت شاہنشاہ عالم از دہلی تا پالم"، بادشاہ بہادر شاہ ظفر مرحوم تو بس لال قلعہ تک تھے اور ان کے مرنے کے بعد غدر بھی نہ ہوتا تو بھی شاہی خاندان قلعہ سے نکال دیا جاتا۔ میاں مستقبل کی سوچو یہ گڑے ہوئے مردے کب تک اکھاڑو گے۔

میر مہدی: میرا مطلب بادشاہت سے نہ تھا میں اس انتشار پر سوچ رہا تھا جو سو ڈیڑھ سو برس سے برپا ہے۔ دہلی نے اس زمانے میں نادر گردی، بھاؤ گردی، جاٹ گردی، روہیلا گردی غرض کہ طوفان ہی دیکھے ہیں اور ان طوفانوں میں جو شیرازہ بندی

شہنشاہیت کے نام پر صدیوں سے جاری تھی اس کا تار و پود ہمیشہ کے لیے بکھر گیا۔ اب اس کی جگہ نئی بنیاد کیا ہوگی مجھے تو کوئی نظر نہیں آتی اور جو نظر آ رہی ہے وہ دل بندی ہے جس میں ہندو مسلمان سے، شیعہ سنی سے اور وہابی بدعتی سے دست بہ گریباں ہے۔

غالب: تو پھر میرا تو خیال ہے کہ ان جھگڑوں نے آنے والوں کی منزل اور بھی آسان کر دی ہے۔

شیونرائن: آسان یا مشکل، ہندوؤں میں تو جو فرقے مٹانے نکلے تھے وہ خود ہی فرقہ ساز بن گئے۔

غالب: نہیں عزیزم، آسان اور بہت آسان میرا شعر یاد کرو۔

بس کہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حقیقت یہ ہے کہ انسانیت ان فرقہ وارانہ تعصبات سے ماورا اور بعید ہے میں تو بنی آدم کو چاہے مسلمان یا ہندو یا نصرانی ہو عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں دوسرا مانے یا نہ مانے میرا خیال ہے اب زیادہ لوگ اس حقیقت کو سمجھیں گے۔

کفر و دیں چیست جز آلائش پندار وجود پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دیں تو شود

شیونرائن: بندہ پرور سب مذہبوں کو ملا کر ایک نیا مذہب آخر اکبر نے بھی تو بنایا تھا مگر آخر میں اس کا انجام کیا ہوا آج اس کا نام و نشان نہیں ہے ڈھونڈھو تو بس تاریخوں میں مذکور ہے۔

غالب: مگر میاں شیونرائن بادشاہوں کے اختراع کردہ مذاہب کو انسانیت سے کیا تعلق اور پھر اس میں اکبر کی سیاسی مصلحتیں یہ کوئی گوتم بدھ کی واردات

تھوڑی تھی بادشاہت کے ہتھکنڈے تھے میری مراد تو بس اتنی ہے لو رباعی سنو۔

یارب بہ جہانیاں دل خرم دہ ... دردعوی جنت آشتی باہم دہ
شداد پسر نداشت بائش از جنت ... آں مسکن آدم بہ نبی آدم دہ

میر مہدی: مگر قبلہ یہ تو تصوف کے رمز ہوئے۔ بتائیے یہ کہ اس نئی سماج کی بنیاد کیا ہوگی۔

غالب: بنیاد وہی اللہ کی دی ہوئی عقل میں نے قاطع برہان کے مقدمے میں لکھا تھا کہ:

"— یزداں دل دانا وچشم بینا بہر آں دادہ است کہ کار دانش وبینش ازیں ہر دو گوہر یہ فرگیریم و ہرچہ بنگریم جز بہ دستوری دانش آں را نپذیریم —"

سو آج بھی میرا ایمان ہے اور میں اسی عقل کے بل پر مذاہب جداگانہ کے بجائے توحید خالص پر ایمان لاتا ہوں اور ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں کہ:

لا الٰہ الا اللہ لا موجود الا اللہ لا مؤثر فی الوجود الا اللہ۔

شیو نرائن: مگر یہ عقیدہ تو اپنشد اور ہندوؤں کے بہت سے مذاہب میں مشترک ہے۔

غالب: میں نے کب کہا تھا کہ نہیں ہے ہندوؤں میں ہی نہیں نصرانی، مجوس، زردشتی سب بندگان خدا نے یہی تعلیم دی ہے پھر اگر ہم اسے بھلادیں تو ہماری غلطی ہے۔

میر مہدی: مگر دنیا کا انتظام، نظام مدنیت، حکومت، خاندان اس کی صورت کیا ہوگی۔

غالب: صورت کیا ہوگی عقل کا ہے کے لیے ہے آخر افلاطون اور فارابی نے اپنا نظام تمدن کس بنیاد پر قائم کیا تھا اخلاق ناصری نے کیا تعلیم دی ہے اور علمائے ایرانیوں کو دیکھو کہ انھوں نے دنیا کو کیسا سبق دیا تھا کہ آج تک ہر ایک ان کا تتبع کرتا چلا آتا ہے۔ آخر پچھلے ہزار برس میں ہم ایرانیوں کے نقش قدم پر نہیں چلے تو

حکومت اور تہذیب کہاں سے سیکھی میاں ژند و اوستا پڑھو۔

میر مہدی: مگر فرنگی راج کو کیا کہیے گا۔

غالب: فرنگی نے بھی آخر اپنے آئین از روئے عقل ہی بنائے اور ہم سے بہتر بنائے فرنگی کو کب دعویٰ ہے کہ میں از روئے مذہب کلیسائی حکومت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ فرنگی میں اور ہم میں بس اتنا فرق ہے کہ وہ عقل سے کام لیتا ہے اور ہم نہیں لیتے میں نے اتنی ہی سی بات تقریظ میں لکھی تھی کہ سید احمد خاں برا مان گئے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ ——— شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند۔

راوی: یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ تفتہ اپنی سنبلستان بغل میں دبائے دروازے سے داخل ہوئے اور خالی مونڈھے پر بیٹھ گئے۔

غالب: مرزا تفتہ تم ہی فیصلہ کرو میں بیٹھا اپنے کچھ شعر پڑھ رہا تھا وہی جو تمہیں بھی یاد ہوں گے۔

مژدہ صبح دریں تیرہ شبانم دادند　　شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند

کہ ایک بحث اٹھ کھڑی ہوئی کہ ہماری تہذیب اور ہمارے ادب کا کوئی مستقبل ہے یا نہیں میں کہتا ہوں کہ ہے گو مصنوعی اعتبار سے اس کی شکل بدل جائے گی یہ حضرت نہیں مانتے۔

تفتہ: قبلہ میں تہذیب کے جھگڑے میں تو پھنسنا نہیں چاہتا اس لیے کہ ہم سب کی تہذیب قطعاً ایک اور یکساں ہے۔ ناموں میں بظاہر فرق ہے مگر در دست ہم سب مرزا اور مرزا سیرت ہیں، فارسی پڑھتے اور لکھتے ہیں اور شعر کہتے ہیں یا یہ کہیے کہ کہنے کی کوشش کرتے ہیں، یعنی ہم نوآموز لوگ۔ مجھے تو صرف اس سے دلچسپی ہے کہ اس نظم و نثر اور اس ادب کا آئندہ کیا حشر ہو گا۔ بالفاظ دیگر یہ ایک عملی سوال ہے آپ یہ بتائیے کہ ہم قلعہ معلی کے بعد کیا لکھیں کس کے لیے

لکھیں اور کیسی زبان میں لکھیں میری مراد فارسی اور ریختہ دونوں سے ہے۔

غالب: آخر مشکل کیا ہے؟ یہ سوال تمہارا ہی نہیں جمیں اسکنز الیگزینڈر آزاد اور شور کا بھی ہے، حالانکہ یہ سب نہ ہندو ہیں نہ مسلمان، نہ قلعہ کے وابستگاں سے ہیں ایک ادبی روایت چلی آتی تھی اور یہ لوگ بھی ہماری طرح اس کا تتبع کرتے تھے۔

تفتہ: ایمان کی بات ہے کہ مسجع اور مقفیٰ عبارتیں نثر میں ان کا قدر کرنے والا اب کوئی نہیں ہے۔ آپ ہی انصاف سے کہیے کہ آپ نے جو تقریظ سید احمد خاں کی آثار الصنادید پر لکھی ہے اسے کون پڑھے اور سمجھے گا۔

غالب: مجھے اپنے ایمان کی قسم میں نے اپنی نظم و نثر کی داد باندازۂ بایست نہیں پائی۔ آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا، مگر بہر حال جو روایت چلی آتی تھی اس میں بڑے سے بڑے اہل کمال کا تتبع کیا بلکہ ان کے ہم رتبہ اور ہم مرتبہ درجہ حاصل کرنے کی سعی کی۔

تفتہ: مگر ہم کیا کریں ہم نو آموز تو آپ کے ہم مرتبہ ہونے کا حوصلہ نہیں رکھتے اور پھر مسجع نثر میں نظم کی بات خیر دوسری ہے کہ از دل خیزد بر دل ریزد اس نثر کا تو بادشاہت کے بعد کوئی پرسان حال ہے نہیں۔

غالب: تو اس میں اشکال کیا ہے جس طرح بہادر شاہ کا تخت و تاج گیا اسی کے لوازمات میں تمہاری نثر بھی تھی وہ بھی گئی۔ تم اسی طرح لکھتے تھے جس طرح امراء اور شرفاء بولا کرتے تھے اب اس طرح لکھو جس طرح آپس میں بات چیت اس وقت کر رہے ہو۔ تحریر گویا وہ مکالمہ ہے جو باہم ہوا کرتا ہے میرے خطوط دیکھو۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرزا صاحب نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں

وصال کے مزے لیا کرو۔ اس میر مہدی کو دیکھو اردو عبارت لکھنے کا ڈھنگ کیا ہاتھ آگیا ہے سارے جہان کو سر پہ اٹھایا ہے۔

تفتہ: مگر قبلہ مہدی نوجوان ہے میرے سامنے سوال پرانے اسلوبوں کو بھلانے کا ہے، اور پرانی عادت جاتے جاتے ہی جائے گی۔ اپنی نئی نثر کا کوئی اصول بھی تو بتائیے۔

غالب: عزیز از جان اصول کوئی خاص نہیں میں نے مدت ہوئی اپنے فارسی رسالے میں لکھا تھا کہ:

"— مکتوب الیہ را بہ لفظے کہ فراخور حال اوست آوازہ دہم و زمزمہ سنج مدعا گردم۔ القاب و آداب گوئی و عافیت جوئی حشو نماید است و بخشگاں حشو را دفع بہتر۔ نامہ نگار را باید کہ نگارش را از گزارش دور تر بزدہ بنشستن را رنگ گفتن دہد —"

بس اس عام کلیہ کا لحاظ رکھنا کافی ہے۔

شیو نرائن: مگر مرزا صاحب نئی نسل کے سامنے تو عجیب و غریب مصیبت یہ آکھڑی ہوگی کہ لوگ، فارسی بھول جائیں گے اور اردو کی جگہ انگریزی زبان لینا شروع کردے گی آخر اردو تو شاہ صاحب کے خاندان کے لوگ بھی لکھا کرتے تھے، مگر میری مراد اردو سے وہ شستہ اور صاف زبان ہے جو قلعہ معلی میں بولی جاتی تھی۔

میر مہدی: یہ کیوں نہ کہیے کہ اردو زبان خود اردو والوں کو سکھائی جائے۔

شیو نرائن: مگر اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے میرا بس چلے تو مبتدیوں کے لیے اردو کا قاعدہ لکھ دوں۔

غالب: عزیزم! دعا دو عارف مرحوم کے بچوں کو کہ ان کی بدولت میں نے اس

کام کی ابتدا کر دی ہے یہ دونوں بچے انتہا درجے کے شریر تھے۔ اور میں نے ان کے بہلانے کے لیے قادر نامہ لکھا تھا مجھے آج تک اس کا گمان بھی نہ تھا کہ یہ قاعدہ بھی کسی کام آ سکتا ہے۔ مگر شیو نرائن کی بات سے مجھے اندازہ ہوا کہ شاید مفید ہو۔

تفتہ: مگر قبلہ آپ نے تو اسے راز سربستہ ہی رکھا اس کے کچھ حصے سنائیے۔

غالب: آپ تو کچھ ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میرا کوئی قصیدہ یا چیدہ غزل ہو بھائی یہ بچوں کا قاعدہ ہے۔ سادہ زبان ہے ایک دو بچوں کے لیے غزلیں بھی ہیں۔

میر مہدی: بہر نوع کچھ سنا دیجیے۔

غالب: اچھا تو سنو:

قادر اللہ اور یزداں ہے خدا — ہے نبی مرسل پیمبر رہنما
پیشوائے دیں کو کہتے ہیں امام — ہے رسول اللہ کا وہ قائم مقام

اور بیچ کا چھوڑ دیتا ہوں تقریباً آخر میں یہ سبق ہے۔

اسم وہ ہے جس کو ہم کہتے ہو نام — کعبہ مکہ وہ جو ہے بیت الحرام
تیغ کی ہندی اگر تلوار ہے — فارسی پگڑی کی بھی دستار ہے
ہے قلم کا فارسی میں خامہ نام — ہے غزل کا فارسی میں جام نام
کس کو کہتے ہیں غزل ارشاد ہو — ہاں غزل پڑھیے سبق گر یاد ہو

اس کے بعد غزل بھی اسی انداز میں ہے یعنی غزل کیا بچوں کے لیے تک بندی ہے تاکہ انھیں شوق پیدا ہو سو اسے بھی سن لو:

صبح سے دیکھیں گے رستہ یار کا — جمعہ کے دن وعدہ ہے دیدار کا
وہ چرا دے باغ میں میوہ جسے — پھاند جانا یاد ہو دیوار کا
پل ہی پر سے پھیر لائے ہم کو لوگ — ورنہ تھا اپنا ارادہ پار کا

شہر میں چھڑیوں کے میلے کی ہے بھیڑ — آج عالم اور ہے بازار کا
لال ڈگی پر کرے گا جا کے کیا — پل پہ چل ہے آج دن اتوار کا
گر نہ ڈر جاؤ تو دکھلاؤں تمہیں — کاٹ اپنی کاٹ کی تلوار کا

واہ بے لڈے کے پڑھی اچھی غزل
شوق ابھی سے ہے تجھے اشعار کا

تفتہ : تو پھر کیوں نہ کہیے کہ آپ نے بھی خسرو کی طرح خالق باری لکھی اور غزل کا اضافہ کر دیا ہے۔

غالب : مرزا تفتہ ! بات تو یہی ہے ۔ اور اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ خالق باری کی بدولت ہماری فارسی دانی اور عام تعلیم میں کتنا اضافہ ہوا ۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ اگر خالق باری نہ لکھی گئی ہوتی تو نہ ہر کرن ہوتے نہ چندر بھان اور نہ میاں میرزا ہر گوپال تفتہ ۔

تفتہ : تو پھر قادر نامہ کے بعد اردو سے معلیٰ کی زندگی کے لیے عمر دوام کی امید کی جا سکتی ہے ۔

غالب : عزیزم عمر دوام کا نام نہ لو بہادر شاہ ظفر کے پیشرو بھی ہمیشہ اپنی دولت کو "بہ ابد مقرون" لکھا کرتے تھے تو اس کا حشر ان آنکھوں نے دیکھ لیا یہ کہو کہ اردو کی بقا کے لیے کوشش کرنی چاہیے ہیں اور تم سب کوشش کر سکتے ہیں ۔

راوی : یہ گفتگو جاری تھی کہ جواہر سنگھ اور علاء الدین احمد خاں اور شریک محفل ہو گئے مگر ان حضرات کے آنے سے فضا بدل گئی ۔ اب ہر طرف سے تقاضا تھا کہ غالب اپنے عزیز شاگردوں کو کچھ کلام سنائیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ شرط بھی تھی زار نالی کے بجائے امید اور شگفتگی ہو اور یاس کا پہلو کہیں نہ آنے پائے ،

طبیعت حوصلہ اور امنگ کی متلاشی نہیں ۔

غالب: (کچھ سوچنے کے بعد) اچھا تو سنو کہاں کا دکھڑا کہاں کا سوگ شباب کو یاد کرو اور مست رہو بقول خود میرے ع ہمہ بر روز گار می خندیم ۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمک داں کیے ہوئے

باہمدگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرض متاع عقل و دل و جاں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذر دلفریبیٔ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بار منت درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

راوی: اب رات ہو چکی تھی اور غالب بھی تھکے ماندے تھے سب شاگردوں نے اجازت چاہی اور سلام کر کے رخصت ہو گئے ۔

حمید احمد خاں

اسد اللہ خاں تمام ہوا

غالب کی زندگی اپنے آغاز و انجام اور درمیانی واقعات کی ترتیب وار تقار کے لحاظ سے ایک ڈرامائی کیفیت رکھتی ہے۔ دنیائے شعر میں تو مرزا غالب خلاقِ معانی اور فن کار تھے ہی، لیکن اُن کی شخصی زندگی کے مرقع کو بھی رنگ اور روشنی اور سائے کی آمیزش نے ایک مستقل فنی کارنامہ بنا دیا ہے۔ غالب کی زندگی کا پورا ڈراما، تخیل کی ذرا سی کوشش سے، ہم پر خود بخود منکشف ہو جاتا ہے۔ یہ ڈراما سلطنتوں کے ہبوط و زوال، عظیم الشان اخلاقی و دینی قوتوں کی پیکار، اور مشرق و مغرب کی فیصلہ کن آویزش کے پس منظر پر نمودار ہوتا ہے۔ غالب کے سوانح حیات کا قاری صرف یہ کرتا ہے کہ نصف صدی کے واقعات کے پھیلاؤ کو سمیٹ کر اپنے فنی شعور کے دائرے کے اندر لے آتا ہے۔ اور پھر یہ حیرت انگیز ڈراما خود بخود حرکت کرنے لگتا ہے۔

مرزا غالب نے اکہتر برس کی عمر پائی۔ ان کا زمانۂ حیات مسلمانانِ ہند کے سیاسی زوال کا زمانہ تھا۔ جنوب سے مرہٹوں، مغرب سے سکھوں، مشرق سے انگریزوں نے مغلوں کی سیاسی طاقت پر پے در پے حملے کیے لیکن مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا ایک ننھا سا نقطہ پھر بھی ہندوستان کے قلب میں روشن رہا۔ اس روشن نقطے

کا نام تھا ——۔ دلّی۔ اُنیسویں صدی کی دلّی میں اہلِ کمال کا ایک ایسا مجمع نظر آتا ہے جس سے اکبری اور شاہجہانی عہد کے علم و فضل کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اہلِ کمال کی اس جماعت پر نظر ڈالیے تو بزرگوں میں شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسمٰعیل، مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین خاں آزردہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اور مولوی امام بخش صہبائی، شیخ محمد ابراہیم ذوق اور حکیم مومن خاں مومن اور نوجوانوں میں سید احمد خاں اور حالی، ذکاءُ اللہ اور نذیر احمد کے پائے کے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔

اسی دلّی میں ۱۸۴۳ء کے موسم گرما کا ذکر ہے کہ ایک دن سہ پہر کے وقت مرزا اسداللہ خاں غالب کے مکان کے باہر……

ایک خوش الحان فقیر: کنکر چُن چُن محل بنایا مُورکھ کہے گھر میرا ہے
نا گھر میرا، نا گھر تیرا، چڑیا رین بسیرا ہے
نا گھر میرا، نا گھر تیرا……

(آواز دور ہوتی جاتی ہے)

[گھر کے اندر بیگم غالب تخت پر بیٹھی ہیں۔ صحن میں بیری کے درخت سے طوطے کا پنجرا ٹنگا ہے]

بیگم غالب: ددا! اے ددا! ذرا اُٹھو جلدی سے۔ لیجیو، یہ ادھنّا دروازے تک جا کر بچارے کو دے آئیو۔ (ددا جاتی ہے) (ایک آہ سرد کے ساتھ تاسف آمیز لہجے میں آہستہ) چڑیا رین بسیرا! چڑیا کے بھاگ پھر اچھے کہ اپنے گھونسلے میں تو بیٹھی ہے۔ اور میں! نواب الٰہی بخش خاں کی بیٹی! —— غریب کے سر پر بھی اپنا جھونپڑا ہوتا ہے، لیکن میرے لیے دلّی میں کرائے کے مکانوں کے سوا، اب کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ ابا جان نے آنکھیں کیا بند کیں، میرے

نصیب ہو گئے۔ چار سال سے چولہا اٹھائے گھر گھر پھرتی ہوں اب برسوں کے رکھے ہوئے، زربفت اور کمخواب کے جوڑے بھی ایک ایک کر کے بکنے لگے۔ کلکتے کا سفر مجھے تو بہت مہنگا پڑا۔ کیا کیا اُمیدیں لے کر مرزا صاحب روانہ ہوئے تھے اور پھر کس حال میں واپس ہوئے، اب چھ مہینے بعد بھی کوئی ایک نیک خبر کلکتے سے نہیں آئی (ذرا بلند آواز سے) دوا! مدار خاں سے کہو مرزا صاحب سے پوچھے کہ ٹھنڈا پانی دیوان خانے میں پئیں گے یا ..... کیا کہا؟ — آ رہے ہیں تو بس ٹھیک ہے —

[طوطا بولتا ہے]

لو اب میاں مٹھو کو تھوڑی سی چُوری دے دو۔

[مرزا غالب آتے ہیں]

غالب: چڑیا رین بسیرا۔ آپ نے بھی یہ وعظ سُنا؟ لیکن زندگی کتنی ہی بے ثبات ہو اس کا یہ مرتبہ تو دیکھیے کہ اس پر وعظ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے (طوطا پھر بولتا ہے) کہو میاں مٹھو! اب کیا فریاد ہے؟ آج چُوری نہیں ملی؟ ارے میاں خوش رہو۔ نہ تمہارے بچے نہ جورو، چوری کھاؤ اور مزے کرو۔ یہی زندگی ہے۔

بیگم: ان باتوں سے کیا فائدہ؟ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری اپنی زندگی کیسی ہے؟

غالب: اچھی — اور بُری — اور اچھی!

بیگم: اب یہ پہیلیاں بھلا کون بُوجھے!

غالب: بات تو صاف کہتا ہوں سب سے پہلے اچھی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ شروع میں برسوں تک زندگی خوب گزری۔ پھر بُری اس لیے کہا کہ چار پانچ برس سے ہم لوگ چکر میں ہیں۔ اور پھر دوبارہ اچھی اس لیے کہ مقدمے کا فیصلہ ہوتے ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

بیگم : میں تو پانچ سال سے انہیں اُمیدوں پر جا رہی ہوں!

غالب : تو مایوس ہونے کی کوئی وجہ بھی ہو؟ سرکار انگریزی نے پچیس برس پہلے ہم دونوں بھائیوں کے لیے دس ہزار سالانہ کی جاگیر مقرر کی۔ شمس الدین خاں نواب ہیں تو نیروز پور جھرکہ کے ہیں، میرے سرکاری وظیفہ کے نواب نہیں ہیں۔ نہ اس میں تصرف کرنے کے مجاز ہیں۔ ہمارے اس دس ہزار کو پندرہ سو کون بنا سکتا ہے؟ سرکاری شقّے کسی کی جعل سازی سے بدل نہیں جاتے۔ یہ رقم مل کر رہے گی، بلکہ اگر انصاف ہوا تو اب تک جس قدر کم رقم ملتی رہی ہے۔ اس کی واصلات ابتدا سے آج تک دلوائی جائیگی۔

بیگم : (زہر خند سے) انصاف! میں نے صرف اس کا نام سنا ہے۔ انصاف کرنیوالے حاکم بدلتے ہیں، معزول ہوتے ہیں، مرتے ہیں، مگر انصاف نہیں ہوتا۔

غالب : انصاف ہوگا!

بیگم : نہیں ہوگا! ایسے انصاف کو میں کیا کروں جس کے انتظار میں ایک بھائی پاگل ہوگیا اور دوسرا ——

غالب : اور دوسرا؟

بیگم : اور دوسرا مٹ گیا۔ چکی کے دو پاٹوں تلے پس کر رہ گیا۔

غالب : میرا پس جانا کچھ ایسا آسان نہیں ہے۔ چکّی کے پاٹ البتہ گھس گئے ہیں۔ ابھی اور گھسیں گے۔

(باہر کے دروازے پر دستک۔ مدار خاں ملازم آتا ہے)

مدار خاں : سرکار! مولانا فضل حق صاحب کا آدمی یہ رقعہ چھوڑ گیا ہے۔

غالب : مولانا کو آج خود یہاں آنا تھا۔ خیر، لاؤ۔ (رقعہ کھولتے ہوئے) اچھا! کروڑی مل مہاجن کو میرے خلاف ڈگری مل گئی۔ ہوں! کروڑی مل بھی کیا کرے

کلکتے جانے سے پہلے اُس سے قرضہ لیا تھا۔ اب کروڑی مل اور دیوانی عدالت کا پیادہ میری تلاش میں منڈلا رہے ہیں۔

بیگم : اب کیا ہوگا؟

غالب : ہوگا کیا، گھر میں بیٹھوں گا (طوطا بولتا ہے) میاں مٹھو سے باتیں کروں گا۔ آپ کی نماز میں حارج ہونگا۔ دستور کے مطابق شرفا کو دیوانی عدالت کے ڈگری دار گھر کے اندر تو گرفتار کر نہیں سکتے، اور دن کے وقت میں باہر نکلنے سے رہا۔ (ذرا ہنس کر) دونوں وقت ملتے جب چراغ میں بتی پڑتی ہے، میں بھی چمگادڑ کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے نکلا کروں گا، اور باہر کا کام دھندا کر آیا کرونگا

مدار خاں : دیکھو سرس کی گلی جاؤ۔ جو چھینٹ آج میں نے غزل کے لیے خریدی تھی وہ عزیز النسار خانم میری بھتیجی کو دے آؤ۔ (بیگم سے ذرا دھیمے لہجے میں) وہ بچی نئے کپڑے کو ترس گئی ہے — اور دیکھو یوسف بیگ خاں کا حال پوچھنا اور کہہ آنا کہ میں آج حکیم صاحب کو نہیں لاؤں گا۔ ہاں کل مغرب کے بعد انہیں ساتھ لیے آؤں گا۔ (مدار خاں جاتا ہے) بچارا یوسف! ہمارے لڑکپن میں لوگ کہا کرتے تھے کہ دونوں بھائیوں میں وہی کماؤ ہوگا۔ کیا بدن تھا، جیسے لوہے کی لاٹھ! اور جب حیدر آباد سے اپنے رسالے کو چھوڑ کر آیا تو دیکھ کر دل کانپ جاتا تھا — مجذوب، مخبوط، ٹوٹی ہوئی کمان کی طرح بے حال! اگر اُس کا حال ٹھیک ہوتا تو میں اس مقدمے کے لیے شاید اُسی کو کلکتے بھیجتا۔

بیگم : اُف! کلکتے کا نام سن کر میرے سینے میں ایک تیر لگتا ہے۔ اس کلکتے کی اُمید نے ہمیں ویران کر دیا۔ ورنہ لکھنؤ کے دربار سے کچھ نہ کچھ مل گیا ہوتا۔

غالب : (ذرا تلخی سے) تمہیں لکھنؤ کے دربار کا حال کیا معلوم؟ روشن الدولہ کے ہاتھ دو چار ہزار کے عوض اپنی آبرو بیچ ڈالتا؟ وہ اگر نائب السلطنت تھا تو

میں بھی خاندانی شریف زادہ تھا۔ وہ میری تعظیم دینے پر کیوں آمادہ نہ ہوا؟ کیا اس کے لیے یہ کافی نہ تھا کہ میں نے اس کی مدح میں ایک نثر تیار کی؟ اس کے ساتھ یہ شرط کیوں لگائی گئی۔ کہ گداگروں کی طرح نذر بھی پیش کروں؟ میں نے فوراً کہا کہ میں ایسی حضوری سے معافی چاہتا ہوں۔

بیگم: اچھا ہمارا مقدر!

غالب: جو کچھ مقدر میں لکھا ہے۔ وہ تو ہو کر رہے گا۔ ہم اگر شکوہ کریں بھی تو کیا حاصل؟

بیگم: ہاں تمہارے لیے سب کچھ آسان ہے۔ اور نہیں تو شعر لکھ کر دل کی بھڑاس نکال لی۔

غالب: آپ کے آنسوؤں سے بھی تو دل کی بھڑاس خوب نکل جاتی ہے!

بیگم: (دردناک آواز میں) تو کیوں نہ روؤں! باپ مر گیا۔ بھائی سے تمہاری ان بن ہو گئی۔ مکان بک گیا۔ گھر میں جو زیور یا کپڑا تھا وہ بھی یہ جاگیر کا مقدمہ کھا گیا۔ اب تمہارے پیچھے عدالت کے پیادے قید کرنے کو پھرتے ہیں۔ بچے تھے۔۔۔۔۔۔۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) وہ مر کر مجھے جس سناٹے میں چھوڑ گئے میرا ہی دل جانتا ہے (سسکیاں لے کر روتے ہوئے) کیسے پیارے بچے تھے جیسے چاند کے ٹکڑے۔ ابھی تتلانا ہی شروع کیا تھا کہ اللہ کو پیارے ہو گئے (روتے ہوئے) ایک ایک کر کے سب گئے۔ پہلا۔۔۔۔ اور دوسرا، پھر تیسرا بھی۔۔۔۔۔۔ چوتھا بھی۔

(مختصر وقفہ)

غالب: (آہستہ سے) ذرا! کیا زین العابدین خاں آج ادھر نہیں آیا؟ میں نے صبح اس سے کہا تو تھا کہ گھڑی دو گھڑی کے لیے اپنی خالہ کے پاس ہو جایا کرو ——— بڑا نیک بخت لڑکا ہے کسی کام کی وجہ سے رک گیا ہوگا۔ دیکھو

صبح ان کے ہاں جانا اور کہنا میاں بھول کیوں گئے؟ تمہاری خالہ تنہائی میں کڑھتی رہتی ہیں۔ یہاں آؤ گے، کچھ میں تمہیں پڑھا دوں گا۔ کچھ تمہاری خالہ تم سے باتیں کریں گی، ان کا جی بہل جائے گا...... او بیگم اب جلد ہی ہمارے دن پھریں گے۔ میرے کاغذات گورنر جنرل کے سامنے عنقریب پیش ہوں گے۔ انگریز سکریٹری میرا دوست ہے.......

بیگم: ہاں مگر سال بھر پہلے وہ بھی تو تمہارا دوست تھا۔ دلی کا انگریز ایجنٹ....

غالب: کول بُرک؟

بیگم: جو معزول ہو گیا۔ خیر پھر تم نے دل کو یوں تسلی دی کہ اس کی جگہ دوسرا انگریز دوست آ گیا۔

غالب: ہاں ہاں فریزر۔

بیگم: لیکن فریزر چھ ہفتے کے اندر بدل گیا اور اس کی جگہ نیا ریزیڈنٹ آیا جو تمہارا نہیں، شمس الدین خاں کا دوست ہے۔

غالب: تو کیا ہوا ہر بار ایسے ہی اتفاق تو پیش نہیں آئیں گے۔ نہ ہاکنز کی روداد پر آخری فیصلہ ہو جائے گا۔ کلکتے میں لاٹ صاحب کا سکریٹری اسٹرلنگ صاحب میرا مخلص اور بہی خواہ ہے۔ کیا خوب آدمی ہے۔ پہلی ملاقات میں شریفوں کی طرح اٹھ کر مجھے تعظیم دی۔ اپنے ہاتھ سے عطر اور الائچی پیش کی اور بعد میں بھی ہمیشہ تکریم سے پیش آتا رہا۔ میرے کاغذات اسی کے ہاتھ سے نکلیں گے۔ پھر ابھی چند سال وہ اپنی جگہ سے ٹل بھی نہیں سکتا۔ اس لیے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اسٹرلنگ کلکتے میں ہے تو سب ٹھیک ہے۔

(باہر کے دروازے پر دستک)

بیگم: یا الٰہی خیر! اب یہ کون آیا؟

غالب: کوئی نہیں، مدار خاں واپس آیا ہوگا۔

(مدار خاں آتا ہے)

مدار خاں: سرکار صدر الصدور صاحب کا آدمی میرے ساتھ ہی پہنچا اور یہ پرچہ دے گیا۔

غالب: آج سب دوستوں کی طرف سے ایک ایک رقعہ ضرور آئے گا۔ لاؤ دیکھیں کیا کہتے ہیں، مفتی صدر الدین خاں صاحب (کاغذ کھولتے ہیں)

بیگم: خدایا کوئی خیر کی خبر دیجو!

غالب: کلکتے سے ...... خبر آئی ہے ...... اسٹرلنگ صاحب ۲۳ رمئی کو مر گئے — ہائے جواں مرگ۔

(یہ مرزا غالب کی زندگی کا ایک رُخ تھا۔ لیکن اس ذاتی اور خانگی پریشانی کے علاوہ اُن کی زندگی کے کچھ اور پہلو بھی تھے۔ ان پہلوؤں کا تعلق اُن کے روشن ضمیر دوستوں کی صحبت اور ان کی بڑھتی ہوئی شاعرانہ شہرت سے تھا۔ لارڈ ولیم بنٹنک، گورنر جنرل نے مقدمے کا فیصلہ ان کے خلاف کیا۔ کچھ پرانی پریشانیوں میں کمی ہوئی، کچھ نئی پریشانیوں کا اضافہ ہوا، اسی طرح اور بارہ سال گزر گئے۔ اس زمانہ میں ایک صبح کا ذکر ہے کہ مولانا فضل حق خیرآبادی مرزا غالب کے مکان پر پہنچے۔

مولانا: ارے بھئی مرزا، اب اٹھو اور خدا کا نام لو۔ مردِ خدا یہ بھلا سونے کا وقت ہے میں دو گھڑی تم سے بات کرنے آیا تھا اور تم ہو کہ شرابیوں کی طرح صبح کے وقت غافل پڑے ہو۔

غالب: یہ جو آپ نے مجھے شرابی سے تشبیہ دی، اسے اصطلاح میں تشبیہ تام کہتے ہیں۔

مولانا: اب آپ علم معانی پر اپنا درس رہنے دیجیے، اور ذرا اُٹھ کر ہاتھ منہ دھو لیجیے

غالب: بھئی مولانا، مجھے اتنی مہلت تو دو کہ تمہاری تشریف آوری پہ ذرا خوش ہولوں۔ میں خواب دیکھ رہا تھا کہ قلعہ معلیٰ سے چوبدار نے آکر خبر دی کہ جہاں پناہ نے یاد فرمایا ہے سو اسی خواب کی تعبیر تمہاری ملاقات ہے ۔

جہانے مختصر خواہم کہ در دے
ہمیں جائے من وجائے تو باشد

کلّو! آفتابے میں پانی لاؤ۔ ذرا منہ بھی دھولیں اور باتیں بھی کرتے جائیں اور دیکھو مولانا کے لیے شربت بھی لاؤ۔ مولانا، یہ پیشگاہِ حضور میں طلبی کا خواب کچھ اور معنی بھی رکھتا ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں کبھی کبھی میرا ذکر کرتے ہیں۔ میاں ابراہیم خاقانیٔ ہند حسب معمول اس پر جز بز ہوتے ہیں۔ لیکن بادشاہ سلامت کو اس طرف توجہ ضرور ہو گئی ہے۔ خیر یہ قصہ تو پھر سناؤں گا آپ کہیے کہ صبح صبح کیسے آنا ہوا۔

مولانا: بھئی پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، یہ غیر مقلدین کا فتنہ کسی طرح فرو ہونے میں نہیں آتا۔

غالب: میں تو آپ کے مقلدین میں سے ہوں۔ یوں کہ منہ دھوئے بغیر دین کی بات نہیں کرتا۔ لیجئے یہ شربت نوش فرمایئے اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔

مولانا: مرزا، اس پیالے میں سے دو ایک گھونٹ پہلے تم پیو!

غالب: یہ کیوں؟

مولانا: اس لیے کہ تمہاری زبان کا اثر میری زبان میں آجائے۔

غالب: مولانا اگر ایک رند گناہگار کو یوں کانٹوں میں گھسیٹو گے تو میں اٹھ کر تمہارے قدموں کو چھو لوں گا۔ میرے لیے یہی سعادت کم نہیں کہ میں ادھم

ایک ہی سال پیدا ہوئے اور تم نے جوانی سے لے کر اس عمر تک جس طرح میری رہنمائی کی ہے ......

مولانا: تو بھی مرزا! اُس رہ نمائی کے بدلے، اب کچھ میری رہنمائی کرو۔ وہی مسئلہ امتناعِ نظیرِ خاتم النبیین ...... —— اس پر اپنا اور وہابی جماعت کا اختلاف مجھے پریشان کر رہا ہے۔ تم میرا یہ عقیدہ جانتے ہو کہ خاتم النبیین کا مثل ممتنع بالذات ہے یعنی جس طرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح خاتم النبیین کا مثل بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ ان کو اصرار ہے کہ خاتم النبیین کا ممتنع بالغیر ہے، ممتنع بالذات نہیں ہے یعنی آنحضرتؐ کا مثل اس لیے پیدا نہیں ہو سکتا کہ اس کا پیدا ہونا آپ کی خاتمیت کے منافی ہے، نہ اس لیے کہ خدا اس کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ مرزا تم ذرا غور کرو کہ کیا یہ بالواسطہ ختمِ نبوت سے انکار نہیں ہے؟

غالب: ہے، مگر مولانا اگر خدا لگتی سنو تو میں یہ کہوں کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ذاتِ باری کی قدرتِ کاملہ سے انکار ہے شاہ اسماعیل کے پیرو اس پہ چراغ پا نہ ہوں تو کیوں؟

مولانا: ارے میاں! یہ کیا کفر بکنے لگے ہو؟ کون خدا کی قدرتِ کاملہ کا منکر ہے۔ تمہارے نزدیک تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی فطرت کے قوانین کو خود ہی توڑے، حالانکہ اس طرح اس کی قدرت محدود ہو جاتی ہے۔ میرے رسالہ بحث ”قاطیغوریاس“ میں یہ ذکر موجود ہے۔ ہاں جس کی طبیعت معقول کے بجائے غیر معقول کی طرف راغب ہو، اس کا راستہ مجھ سے جدا ہے (ذرا ٹھہر کر) تو میں آج اس لیے تمہارے پاس آیا تھا کہ تم سے ایک مبسوط اور مدلل مثنوی لکھنے کو کہوں

جس سے نظیر خاتم النّبیّین کا امتناع ثابت ہو۔ کاش مجھے بھی بیان پر وہی قدرت حاصل ہوتی، جو تمہیں ہے تو میں یہ خدمت خود انجام دیتا۔

غالب: مولانا یہ معاملہ نازک ہے اور شعر وحجت کو جمع کرنا بھی کچھ آسان نہیں تاہم آپ کے ارشاد کی تعمیل ناگزیر ہے میں اس باب میں ضرور فکر کروں گا اب کہو تو مصطفےٰ خاں کے ہاں چلیں۔ وہاں آج صدر الصدور صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ شاید مومن خاں بھی ہوں۔

مولانا: تو آؤ چلیں۔ میری پالکی باہر موجود ہے۔

غالب: بس میں ذرا کان میں دوا ڈال لوں۔

مولانا: کیوں خیریت تو ہے؟

غالب: کچھ دنوں سے اونچا سننے لگا ہوں۔ اس سے گھبراتا ہوں حکیم صاحب نے مسہل پلاکر تنقیہ کیا۔ اس کے بعد ہفتہ بھر عرق انار ترش اور روغن گل مساوی ملاکر چند قطرے نیم گرم — کان میں ٹپکاتا رہا۔ کل سے آب برگ شفتالو نیم گرم ٹپکا رہا ہوں۔ ابھی تک کچھ افاقہ نہیں ہوا۔

مولانا: یہ تشویش کی بات ہے۔ تمہاری تمام دنیا تو بس یہی چشم وگوش کی دنیا ہے۔

غالب: کئی برس ہوئے، میں نے ایک غزل کہی تھی جس کا ایک شعر یوں ہے ؎

لطفِ خرامِ ساقی وذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

اب اِس فردوسِ گوش سے نکلنے کا تصوّر مجھے اُسی طرح مضطرب کر دیتا ہے جس طرح آدم اوّل کو فردوسِ بریں سے نکلنے کا خیال۔ ...... لیجیے دوا تو کان میں پڑگئی، آیئے اب چلیں۔

(اس طرح یہ دونوں ہم عمر، ہم مذاق، ہم علم دوست باتیں کرتے

ہوئے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مکان تک پہنچے نواب صاحب کے دیوان خانے میں مجلسِ احباب جمی ہوئی تھی۔ گانا ہو رہا تھا اور ایک غزل ابھی ختم ہوئی تھی۔ مرزا غالب اور مولانا فضل حق کو سازوں کی موسیقی کے ساتھ صرف آخری لفظ "ایسی" کی گونج سنائی دیتی ہے۔)

شیفتہ: (دونوں دوستوں کو دیکھ کر) آیئے مرزا صاحب، آیئے مولانا، تشریف لایئے میری آنکھیں تو دروازے پر لگی ہوئی تھیں، اور مولانا صدرالدین خاں آزردہ بھی کئی بار پوچھ چکے ہیں۔ مفتی صاحب! یہ لیجیے آخر آہی پہنچے۔ مرزا نوشہ۔

آزردہ: اور مرزا نوشہ کے مرزا شہبالا بھی تو ساتھ ہیں۔ بہت خوب۔ خوش آمدید!

شیفتہ: افسوس صرف اتنا ہے کہ آپ مفتی صاحب کی ایک مرصع غزل سے محروم رہے۔ مفتی صاحب کم گو ہیں اور نغز گو۔ کاش آپ آجاتے اور سنتے۔

غالب: تو آپ میری موجودگی کو عدم موجودگی سے کیوں تعبیر فرماتے ہیں، مجھے وقت کی روانی مقرر نہ فرمایئے کہ ابھی ہوں اور ابھی نہیں ہوں (ہنس کر) ع

ہر چند کہیں کہ ہے۔ نہیں ہے

مولانا: مفتی صاحب یہ بڑا ظلم ہوگا اگر ہم محروم رہ گئے۔

آزردہ: صاحب غزل مختصر ہے اور اس میں بھی کام کے شعر بس دو ہیں۔ آپ کو اصرار ہے تو میں خود ہی سنائے دیتا ہوں۔

مولانا: ارشاد

آزردہ: کھلتا وہ بلا، زلفِ سیہ فام وہ کافر
کیا خاک جیے جس کی شب ایسی، سحر ایسی

["واہ، واہ، مرحبا، کیا شعر ہے" کا شور۔ آزردہ دوسرا شعر پڑھنے سے پہلے یہ مصرع دہراتے ہیں۔ ع کیا خاک جیے جس کی شب ایسی

سحر ایسی، اور پھر یہ شعر پڑھتے ہیں]

یا تنگ نہ کر ناصحِ ناداں مجھے اتنا
یا چل کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

[پھر داد کا شور]

مولانا: کیا اچھوتا انداز ہے! اور پھر یہ زمین! مفتی صاحب یہ زمین کہاں سے پائی؟

غالب: کہاں سے پائی؟ ارے بھائی آسمان سے اور کہاں سے!

شیفتہ: صاحبو! پان اور شربت حاضر ہے۔

غالب: میں تو شربت پیوں گا...... اس شربت کا رنگ مجھے پکار پکار کر بلا رہا ہے..... مولانا، آپ کیوں للچائی ہوئی نظروں سے میرے صدقے قربان ہوئے جاتے ہیں۔ آپ کو اس شربت کا ایک گھونٹ نہیں ملے گا۔

(دوستوں کا قہقہہ)

آزردہ: ہاں صاحب میں ذکر کرنے والا تھا کہ انگریزی گورنمنٹ کو دلی کالج کا انتظام از سرِ نو منظور ہے۔

مولانا: مفتی صاحب! یہ دلی کالج کا نیا انتظام کہیں ویسا ہی نہ ہو جیسا سات آٹھ برس پہلے تاج محل کے لیے تجویز کیا گیا تھا۔

شیفتہ: کیا کہتے ہیں۔ تاج محل کے! آگرہ اس ویرانی پہ بھی ایک مرصع غزل ہے مگر بیت الغزل تاج محل ہے۔

مولانا: یہ تو نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کہتے ہیں نا! انگریزوں کی قدردانی ملاحظہ فرمایئے کہ لارڈ ولیم بنٹنگ نے تاج محل کا تمام سنگِ مرمر اکھڑوا کر فروخت کر دینے کی تجویز کی اور بجائے اس طرح ہوا کہ پہلے اکھڑوائی کا اندازہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ خرچ زیادہ ہوگا اور آمدنی کم۔

غالب: مولانا ؎ عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو! لیکن آپ تو انگریزوں کی

نفرت سے اُبلے پڑتے ہیں، آپ کیا انصاف کریں گے۔

مولانا: نہ مانو، مگر میری یہ بات یاد رکھو کہ انگریزوں کو خدا اختیار دے تو تاج محل اور لال قلعہ میں گدھے بندھوا دیں۔ جامع مسجد کو اپنا اصطبل بنالیں۔

آزردہ: تو مولانا آپ خدا سے سفارش کیجئے کہ انگریزوں کو اختیار نہ دے۔ مجھے تو انگریزوں کے اختیار میں فی الحال کوئی کمی ہوتی نظر آتی نہیں ــــ بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ٹامسن صاحب آگرہ سے دلی آئے ہیں۔ دلی کالج کے لیے سو روپے مہینے پر فارسی کے استاد کا تقرر ہو رہا ہے۔ میں نے مرزا نوشہ سے پوچھے بغیر ان کے لیے تحریک کرادی ہے۔ مشاہرہ نہایت معقول ہے۔ اور یہ جگہ مرزا صاحب کے لیے مناسب بھی معلوم ہوتی ہے

غالب: (ہنس کر) شکر ہے میری شاعری نہیں تو میری زبان دانی آپ کے نزدیک مسلم ہوگئی ــــ یہ منصب واقعی میرے لیے نہایت مناسب ہے اور نہایت نامناسب بھی۔

شیفتہ: مرزا صاحب للّٰہ اس باب میں یوں شاعری نہ فرمایئے، یہ تقرر اگر ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔

غالب: لیکن صاحب میں کیا کروں، کل میری شاعری اس تقرر کا قصہ پاک کر بھی آئی۔

شیفتہ و آزردہ: (چونک کر) یعنی؟

غالب: یعنی یہ کہ پرسوں ٹامسن صاحب نے مجھے یاد فرمایا۔ کل میں پہنچا۔ صاحب کو اطلاع کرائی، خود پالکی سے اتر کر ٹھہرا رہا کہ صاحب حسب دستور استقبال کو نکلیں گے، تھوڑی دیر میں صاحب کا جمعدار ہمہ تن سوال بن کر نکلا کہ آپ اندر کیوں نہیں آتے۔ میں نے کہا، صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے میں کیوں کر اندر جاؤں؟ جمعدار پھر اندر گیا تو صاحب خود باہر نکل آئے

اور بولے جب آپ دربار گورنری میں بحیثیت رئیس کے تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی، لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں۔ اس وقت وہ صورت نہیں ہے۔

آزردہ: ہئے ہئے! مرزا تم نے غضب کر دیا۔

غالب: ہاں میں نے ان کو صاف جواب دیا کہ صاحب میں سرکاری نوکری کو ذریعہ افزائش عزت جانتا ہوں۔ یہ نہیں کہ بزرگوں کی بخشی ہوئی عزت بھی کھو بیٹھوں، بس یہیں بات تمام ہوگئی۔ ٹامسن صاحب نے اپنے دروازے کا رخ کیا اور میں نے غالب علی شاہ کے تکیے کا۔

شیفتہ: سبحان اللہ مرزا صاحب! دنیا کچھ بھی کہے، اس میں شک نہیں کہ خودداری اور آزادہ روی کو آپ نے انتہا پہ پہنچا دیا۔

غالب: کل شام ایک غزل ہو گئی تھی جس میں اتفاق سے یہی مضمون آگیا۔ لیجیے یہ پرچہ ملاحظہ فرمائیے۔

آزردہ: کیوں صاحب! یہ پرچہ وہی کیوں ملاحظہ فرمائیں۔ پڑھ کر سنائیے — محفل کو محروم نہ کیجیے۔

شیفتہ: ہاں صاحب تو پھر ارشاد ہو!

غالب: (واہ وہ تحسین کے شور میں یہ غزل ختم کرتے ہیں)

در خورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا

خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
نام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام کا میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا
تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

(اس طرح مرزا غالب کی زندگی کے پندرہ سال اور گزر گئے اس عرصے میں مرزا صاحب مانے ہوئے بزرگانِ ادب میں شمار ہونے لگے ایک خاندانی صدمہ اس عرصہ میں انہیں پہنچا۔ زین العابدین خاں عارف جوان ہوئے، شاعر بنے، اور مر گئے۔ ان کا چھوٹا بچہ حسین علیخاں اب مرزا صاحب کے گھر میں رہتا تھا۔ اور مرزا صاحب اسے اپنے بیٹے کی مانند عزیز رکھتے تھے۔ شعر و سخن، نغمہ و سرور، محبت و دوستی کی یہ فضا آخر کار ۱۸۵۷ء میں ایک دم برہم ہوئی۔ پہلے مئی میں انگریز قتل ہوئے۔ لیکن پھر ستمبر میں انگریزوں کی فتح مند فوج دلی میں داخل ہوئی اور دلی کے مسلمانوں نے وہ مصیبتیں دیکھیں، جن سے چنگیز اور ہلاکو کی یاد تازہ ہو گئی۔

(ستمبر ۵۷ء میں مرزا غالب اپنے مکان بیٹھے ہیں حسین علی خاں بھی موجود ہیں۔

غالب: بیٹا! بیٹا حسین علی خاں! حکیم صاحب نہیں آئے؟ — بھر اپن تو جان کا روگ بن گیا!

حسین علی خاں: (آواز بلند کر کے) دادا حضرت! شہر میں بلوہ ہو رہا ہے۔

غالب: بلوہ؟ .... ابھی تک۔

حسین علی خاں: (چیخ کر) آپ سن نہیں رہے ہیں، ہماری گلی میں سے لوگ بھاگتے ہوئے جا رہے ہیں؟

غالب: ہاں کچھ شور سا سنائی تو دیتا ہے .... ہائے دلّی، کیا تو اس طرح سِسک سِسک کر مرے گی؟ مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے جا (پھر ذرا دھیمی آواز میں) اودھ کی سلطنت مجھ پر مہربان ہوئی، میری قضا نے اسے دو برس میں ختم کر دیا۔ دلّی کی سلطنت کچھ زیادہ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی ....

حسین علی خاں: (پھر چلّا کر) سنیے۔ بادشاہ سلامت کو گوروں نے پکڑ لیا۔

غالب: (اسی لہجے میں) اچھا یہ شمع بھی بجھ گئی!

حسین علی خاں: (چیخ کر اور سنیے) میر نیکش، ور مولانا صہبائی قتل ہو گئے۔

غالب: (سرد آہ بھر کر) اللہ! ---اللہ!

(ہجوم کا شور گولی چلنے کی آواز)

حسین علی خاں: کلو کہتا ہے، مولانا فضل حق کو گورے پکڑ کر لے گئے۔

غالب: (بے تابانہ) ہائے۔

حسین علی خاں: اور نواب مصطفےٰ خاں اور مفتی صاحب کو بھی۔

غالب: اچھا ہے، اچھا ہے! میں بھی اب کفن پہن کر زندگی کے دن گزاروں گا جاؤ کلو سے کہو، میرے کپڑے لائے میں اپنے دوستوں سے ملنے جاتا ہوں۔ وہ حوالات میں میرے منتظر ہیں۔

(ہجوم کی چیخ پکار)

حسین علی خاں: (کانپتی ہوئی آواز میں) سرس کی گلی سے آدمی آیا ہے .... دادا یوسف بیگ خاں کو گوروں نے مار ڈالا۔

غالب: مر گیا! یوسف مر گیا! اُف ـــ اُوف! میرا بھائی..... (قہقہہ لگا کر)
دیوانے کو گولی مار دی! اُف...... (کانپتی ہوئی آواز میں) بیٹا لوگ
یوسف کو مجنون کہتے تھے۔ آج میں مجنونوں سے بدتر ہوں۔
حسین علی خاں: دادا حضرت خدا کے......
(حسین علی خاں کی آواز گویوں کی باڑھ میں گم ہو جاتی ہے)
حسین علی خاں: دادا حضرت! حکیم صاحب تشریف لا رہے ہیں۔
غالب: اب کیا فائدہ!
میرے سننے کو اب رہ ہی کیا گیا ہے۔

سب

مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا؟

غالب کے ساتھ اعراف میں
غالب جنت میں
غالب اپنے شارحین کے ساتھ
غالب پھر اس دنیا میں
غالب جدید شعراء کی ایک مجلس میں

حزب اللہ

غالب کے ساتھ اعراف میں

الف : آداب عرض کرتا ہوں قبلہ!

غالب: جیتے رہو، جیتے رہو — عالم خاکی سے آرہے شاید — کیسے آنا ہوا۔

الف: بس شوق زیارت کھینچ لایا! فرمائیے اس عالم لاہوت میں کیسے بسر ہو رہی ہے؟

غالب: اجی یہاں دھرا کیا ہے!

الف : اچھا تو پھر وہی کچھ سنائیے جو آپ پر عالم خاکی میں بیتی۔

غالب: ارے میاں! — کیوں بھرے زخم کریدتے ہو — اچھا ہوا! اگر قید حیات و بند غم سے رہائی پائی۔ دکھ ہے تو یہ کہ فرشتوں کے لکھے پر ناحق پکڑا گیا ہوں دم تحریر کوئی آدمی تو تھا نہیں کہ برے بھلے پر نگاہ رکھتا! — بہر کیف ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہا ہوں۔

الف : بہرحال کچھ تو کہیے کہ اس خاکداں میں دن کیسے کٹے۔

غالب: سننا چاہتے ہو؟ — اچھا تو کان دھرو — مگر بیچ میں ٹوکنا مت۔

الف : ارشاد —

غالب: عالم دو ہیں، ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ قاعدہ یہ ہے کہ

عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے
کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں چنانچہ میں آٹھویں
رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں روبکاری کے واسطے عالم آب و گل میں
بھیجا گیا۔

میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں دادا میرا ماوراءالنہر سے شاہ عالم کے وقت
میں ہندوستان آیا — باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جا کر
آصف الدولہ کا نوکر ہوا پھر حیدرآباد میں نواب نظام علی خاں کا ملازم ہوا
وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی — الور کا قصد کیا —
مہاراجہ بختاور سنگھ کی رفاقت میں مارا گیا — میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف
سے اکبرآباد کا صوبہ دار تھا اس نے مجھے پالا میرا حقیقی بھائی بس ایک تھا،
وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا۔

میں نے ایام دبستاں نشینی میں شرح مائۃ عامل تک پڑھا بعد اس کے
لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور اور عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا
فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا۔ ناگاہ ایک
شخص کہ ساسان پنجم کی نسل میں تھا معہذا منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم
کا نظیر اور مومن موحد و صوفی صافی تھا میرے شہر میں وارد ہوا — استاد
بے مبالغہ جاماسپ عہد و بزرجمہر عصر تھا۔

میرا قد درازی میں انگشت نما ہے جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا
اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جب کبھی مجھ کو وہ اپنا
رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے، جب داڑھی مونچھ
میں بال سفید آ گئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے

اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی مگر یہ بھی یاد رکھیے کہ اس شہر میں ایک وردی عام ہے ملا، حافظ، بساطی نیچہ بند، دھوبی، سقے، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑا منہ پر داڑھی رکھتا ہے سر پر بال فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا۔

مغل بچے غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں میں بھی مغل بچہ ہوں عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا تھا

میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگی اور ایک حور اور قصر ملے گا اسی میں اقامت جاودانی اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہوگی تو اس تصور سے جی گھبراتا ہے کلیجہ منہ کو آتا ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی وہ زمردیں کاخ اور طوبیٰ کی ایک شاخ چشم بد دور وہی ایک حور ــــــ

تیرہ برس حوالات میں رہا ۸ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زنداں مقرر کیا ــــ مگر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا برسوں کے بعد اس جیل خانے سے بھاگا تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا پایان کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا جب دیکھا کہ قیدی گریز پا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔

نہ جزا نہ سزا نہ نفریں نہ آفریں نہ عدل نہ ظلم نہ لطف نہ قہر، ایک زمانے میں دن کو روٹی رات کو شراب ملتی تھی۔ پھر صرف روٹی ملے جاتی تھی شراب نہیں کپڑا ایام تنعم کا بنا ہوا تھا۔ اس کی کچھ فکر نہیں کی، ناداری کے زمانے میں جس قدر اوڑھنا بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھا لیا گویا اور لوگ روٹی

کھانے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا۔ بے رزق جینے کا ڈھب مجھکو اسی لیے آگیا ہے۔

رمضان کا مہینہ روزہ کھا کھا کر کاٹا کرتا تھا آئندہ خدا رازق ہے کچھ اور کھانے کو نہ ملتا تو غم تو تھا بس ایک چیز کھانے کو ہو چاہے غم ہی ہو تو کیا غم ہے۔

ایک بار میں بیمار ہوگیا تھا بیمار کیا ہوا توقع زیست کی نہ رہی قولنج اور پھر کیا شدید کہ پانچ پہر مرغ بسمل کی طرح تڑپا کیا آخر عصارۂ ریوند اور انڈی کا تیل پیا اس وقت تو بچ گیا مگر وقفہ قطع نہ ہوا۔ دس دن میں دو بار لاؤ ھی آدھی غذا کھائی گو یا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ گلاب اور املی کا پنا اور آلو بخارے کا افشردہ اس پر مدار رہا۔

ایک برس تک عوارض فساد خون میں مبتلا رہا بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہوگیا طاقت نے جواب دے دیا دن رات لیٹا رہتا تھا۔ — سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے ہر پھوڑے پر ایک زخم ہر زخم پر ایک غار ہر روز بلا مبالغہ بارہ نیرہ پھائے اور پاؤ بھر رہم درکار — اور شب و روز بے تاب — اگر کبھی آنکھ لگ گئی دو گھڑی غافل رہا ہوں گا کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹیس اٹھی جاگ اٹھا تڑپا کیا پھر سو گیا پھر ہوشیار ہو گیا۔ — ۱۲۷۷ھ میں میرا نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا مگر ان تین برس میں ہر روز مرگ نو کا مزا چکھتا تھا — کتاب سے نفرت شعر سے نفرت جسم سے نفرت روح سے نفرت — جتنا خون بدن میں تھا بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ بن کر نکل گیا۔ سن کہاں تھی جو پھر تولید دم صالح ہو تی بہر حال زندہ تھا میاں، ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وبائے

عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا واقعی اس میں میری کسر شان تھی۔

ستر ہ بہتر ہ اردو میں ترجمہ پیر خرف میری بہتر برس کی عمر ہوئی پس میں اخرف ہوا۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں سامعہ باطل بہت دن سے تھا رفتہ رفتہ وہ بھی حافظہ کے مانند معدوم ہوگیا پھر یہ حال تھا کہ جو دوست آتے تھے رسمی پرسش مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی وہ کاغذ پر لکھ دیتے۔ غذا مفقود تھی صبح کو قند اور شیرہ بادام مقشر۔ دوپہر کو گوشت کا پانی سر شام تلے ہوئے چار کباب سوتے وقت پانچ روپے بھر شراب اسی قدر گلاب۔ ـــ اخرف ہوں پوچ ہوں عاصی ہوں فاسق ہوں روسیاہ ہوں یہ شعر میر تقی میر کا میرے حسب حال ہے۔

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

میں انتہائے عمر ناپائیدار کو پہنچ کر آفتاب لب بام اور ہجوم امراض جسمانی اور آلام روحانی سے زندہ درگور رہنا کچھ یاد خدا بھی چاہیے تھی نظم ونثر کی قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام ونشان باقی اور قائم رہے گا۔

غالب بقول حضرت حافظ زفیض عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

(ٹھنڈی سانس)

اور یہ تھا میرا مرنا جینا۔

الف: حق مغفرت کرے۔

غالب: کچھ اور بھی پوچھنا چاہتے ہو؟

الف : اجازت ہو تو ـــ

غالب : اچھا تو پوچھ لو ـــ مگر جلدی کرنا ـــ کیونکہ ابھی تک یک جان بے نوائے اسد کو ہزاروں آفتیں جھیلنی ہیں ـــــــــــ

ـــ میں دشت غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں۔

الف : ہاں تو یہ بتایئے اگر زحمت نہ ہو کہ یہ قید و بند کا کیا قصہ تھا۔

غالب : کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا۔ اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رپورٹ اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا۔ اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی بہت تعریف کی۔ ـ سنا تھا کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفرین کی تھی۔ اور میری خاکساری اور آزادہ روی سے اس کو مطلع کیا تھا یہاں تک کہ اس نے میری رہائی کی رپورٹ بھیجدی ہاگرچہ میں ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا۔

الف : (ٹھنڈی آہ بھر کر) ہونہہ کیسے دکھ کی بات ہے ـــ آپ ایسا شاعر اور قیدخانہ کی ذلت !

غالب : بھلا دکھ کیسے نہ ہوتا ـــ سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا، پھر بدنام ہو گیا اور ایک بڑا دھبہ لگ گیا کسی ریاست میں دخل کر نہیں سکتا تھا۔ مگر ہاں ! استاد یا پیر

مداح بن کر رسم وراہ پیدا کرتا ــــ میری یہ آرزو تھی کہ دنیا میں نہ رہوں روم ہے، مصر ہے ایران ہے بغداد ہے یہ بھی جانے دو کعبہ آزادوں کی جا پناہ ہے اور آستانۂ رحمۃ اللعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے ــــ یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گزر رہا ہے ــــ اور یہ ہے جس کا میں آرزومند ہوں:

رازدانا غم رسوائی جاوید بلاست　　بہر آزار غم از تیغ فسر نگم نہ بود
چہ را عدار دو از دل بہ رہائی لیکن　　طعن احباب کم از زخم خدنگم نہ بود

الف: آپ نے غدر کے متعلق کچھ نہ کہا ــــ ہنگامہ تو ایسا نہ تھا کہ آپ اسے بھول گئے ہوں!

غالب: غدر کی باتیں کیا پوچھتے ہو سنو: مئی ۱۸۵۷ء میں ملک نے یہ فتنہ دیکھا ۱۱ مئی کو پہر دن چڑھے وہ باغی فوج میرٹھ سے دلی آئی تھی۔ یا خود قہر الٰہی کے لیے درپے نزول ہوا تھا۔ بقدر خصوصیت دلی ممتاز تھی ورنہ سرتاسر قلمرو ہند فتنہ وبلا کا دروازہ باز تھا۔ لیکن دلی کب تک محفوظ رہتی، پھر جو احکام دلی میں صادر ہوئے وہ احکام قضا و قدر تھے ان کا مرافعہ کہیں نہیں، اب یوں سمجھ لو کہ نہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے نہ جاہ و حشم رکھتے تھے نہ پنشن رکھتے تھے۔

الف: غدر میں آپ کا بھی کچھ لٹا ــــ

غالب: غدر میں میرا گھر نہیں لٹا مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا۔ بھائی ضیاء الدین احمد صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب ہندی: فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے سو ان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا پھر میں اپنا کلام کہاں سے لاتا۔ اس ہنگامے میں کچھ گورے میرے مکان میں بھی گھس آئے تھے، مگر انھوں نے اپنی نیک خوئی سے گھر کے اسباب کو بالکل نہیں چھیڑا۔ مگر مجھے اور میرے

دونوں بچوں کو اور دو تین نوکروں کو مع چند ہمسایوں کے کرنل براؤن کے روبرو جو میرے مکان کے قریب حاجی قطب الدین سوداگر کے گھر میں مقیم تھے لے گئے کرنل براؤن نے بہت نرمی اور انسانیت سے سارا حال پوچھا اور رخصت کر دیا۔

۱۸۵۸ء میں امن ہوا ــــ حکم ہوا کہ ایام غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو ــــ دوسرے دن میں نے انگریزی خط ان کے نام لکھوا کر ان کو بھیجا مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص مظنۂ محض ہے ــــ تحقیقات فرمائی جائے تاکہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو ــــ فروری ۱۸۶۰ء میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب فرماتے ہیں ہم تحقیقات نہ کریں گے بس یہ مقدمہ طے ہوا اور بار اور خلعت موقوف پنشن مسدود ــــ وجہ لامعلوم ــــ دوشنبہ ۲ مارچ ۱۸۶۳ء کو سواد شہر مخیم خیام گورنری ہوا آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادر کے پاس گیا اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ تمہارا دربار اور خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔

کارساز ما بفکر کار ما　　فکر ما در کار ما آزار ما

سہ شنبہ ۳ مارچ کو ۱۲ بجے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مجھ کو بلایا خلعت عطا کیا اور فرمایا کہ لارڈ صاحب بہادر کے یہاں کا دربار اور خلعت بھی بحال ہے۔

الف : الحمد للہ لیکن غدر کے بعد دلی کا کیا نقشہ تھا۔

غالب : بھائی کیا پوچھتے ہو ــــ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے قلعہ چاندنی چوک ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا ــــ یہ پانچوں باتیں نہیں رہیں تھیں پھر کہو دلی کہاں ــــ

ایک دن میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بلا مبالغہ ایک صحرا لق و دق تھا اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے تھے وہ اگر اٹھ جاتے تو ہو کا مکان ہو جاتا۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا پھر وہ باغیچہ صحن کے برابر ہو گیا یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا فصیل کے کنگورے کھلے ہوئے تھے باقی سب اٹ گیا ــــ پنجابی کٹرہ ــــ دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات صاحب رام کا باغ و حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔

زنہار کبھی یہ گمان نہ کیجیے گا کہ دہلی کی عملداری میرٹھ اور آگرہ اور بلاد شرقیہ کی مثل ہے یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے نہ قانون نہ آئین جس حاکم کی جو رائے میں آئے وہ ویسا کرے۔

۷ نومبر ۱۴ جمادی الاول، سال حال جمعہ کے دن ابو الظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے رہا ہو گئے ــــ انا للہ و انا الیہ راجعون ــــ پھر کہو دلی کہاں ــــ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا اور اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی والے وہاں کی زبان کو اچھا کہتے تھے واہ رے حسن اعتقاد بندۂ خدا اردو بازار نہ رہا اردو کہاں؟ دلی کہاں؟ واللہ شہر نہیں کیمپ رہ گیا تھا چھاؤنی تھی، نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر ــــ

الف: عدالتی کارروائیاں اس زمانہ میں کیسی رہیں؟

غالب: کہہ تو دیا نہ قانون نہ آئین جس حاکم کی جو رائے میں آئے وہ ویسا کرے سنو حافظ ممو بے گناہ ثابت ہوئے رہائی پائی حاکم کے سامنے حاضر ہوا

کرتے تھے املاک اپنی مانگتے تھے قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا تھا صرف حکم کی دیر تھی ایک دن جو حاضر ہوئے مسل پیش ہوئی حاکم نے پوچھا۔ "حافظ محمد بخش کون ہے؟" عرض کیا کہ "میں" پھر پوچھا کہ "حافظ ممو کون ہے؟" عرض کیا "میں — اصل نام محمد بخش ہے ممو کر کے مشہور ہوں —" فرمایا "یہ کچھ بات نہیں حافظ محمد بخش بھی تم حافظ ممو بھی تم سارا جہان بھی تم جو دنیا میں ہے وہ بھی تم ہم مکان کس کو دیں —" مسل داخل دفتر ہوئی میاں ممو اپنے گھر چلے آئے — پھر کہو دلی کہاں — دلی کہاں دکھ درد کی برسات تھی۔ برسات کا نام آگیا — لو پہلے تو مجملاً سنو ایک غدر کالوں کا ایک ہنگامہ گوروں کا ایک فتنہ انہدام مکانات کا ایک آفت وبائی ایک مصیبت کال کی پھر برسات جمیع حالات کی جامع ہے، اکیسواں دن تھا آفتاب اس طرح گاہ گاہ نظر آجاتا تھا جس طرح بجلی چمک جاتی ہے رات کو کبھی کبھی تارے اگر دکھائی دیتے تو لوگ جگنو سمجھ لیتے اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی، کوئی دن نہیں ہوتا کہ دو چار جگہ کسی چوری کا حال نہ سنا جاتا مبالغہ نہ سمجھنا ہزارہا مکان گر گئے سیکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے گلی گلی ندی بہہ رہی تھی، قصہ مختصر وہ ان کال تھا کہ مینہ نہ برسا اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پن کال تھا کہ پانی ایسا برسا کہ بوئے دانے بہہ گئے جنہوں نے نہیں بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے سن لیا دلی کا حال — ؟

الف: اچھا جانے دیجئے ان باتوں کو جب دلی والے نہ رہے تو دلی کہاں رہتی سن کر کلیجہ کٹتا ہے — ہاں یہ تو فرمایئے کہ آپ کے مذہبی عقائد کیا تھے کیونکہ اس کے متعلق لوگوں میں گونا گوں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں آپ کو عالم آب و گل کے کچھ لوگ مشرک کہتے ہیں۔

غالب: میرا کیا بگڑا ـــــ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں، مشرک وہ ہیں جو نومسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے ـــ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لاموجود الا اللہ لامؤثر فی وجود اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے وقت میں سب مفترض الاطاعت تھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہوئی یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ اللعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہیں ثم حسن ثم حسین اسی طرح تا مہدی علیہ السلام

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو مجھ کو جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ دوزخ کا ایندھن ہوں گا۔ اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تاکہ مشرکین اور منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔

مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں ہے پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج اور تاسف ہوتا ہے ـــ صوفی صافی ہوں اور حضرات صوفیہ حفظ مراتب ملحوظ رکھتے ہیں۔

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

شاہ محمد اعظم خلیفہ تھے مولانا فخر الدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اس خاندان کا ـــ

بندہ پرور میں تو بنی آدم کو مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں

اور اپنا بھائی گنتا ہوں، دوسرا مانے یا نہ مانے باقی رہی عزیز داری جس کو اہل دنیا قرابت کہتے ہیں اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے اور اس کے مراتب و مدارج ہیں ــــ میاں کس قصے میں پھنسا ہے ــ خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام یہی ہے مذہب حق والسلام والاکرام۔ علی علی کیا کر اور فارغ البال رہا کر۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست

الف: خوب! ــــ سنتے ہیں کہ آپ مے ناب کے بڑے رسیا تھے۔

غالب: آسودہ باد خاطر غالب ــــ کیا ذکر چھیڑا واللہ۔

اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

جب دو جرعے پی لیے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی دل توانا، دماغ روشن ہو گیا چار بوتل شراب تین شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں، لیکن اپنا تو یہ خیال ہے کہ:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

الف: واہ واہ ــــ مزہ آگیا ــ خیر ــ اور یہ آم وام کی بات کیا تھی، آپ کی دو باتیں تو آم سے چپک کر رہ گئیں کہ میٹھا ہو اور بہت ہو۔

غالب: مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے ۔ آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار ۔ جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں ۔ جان شیریں میں یہ مٹھاس کہاں
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر ۔ کہ دوا خانۂ ازل میں مگر
آتش گل پہ قند کا ہے قوام ۔ شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام

صاحب شاخ و برگ و بار ہے آم   ناز پروردۂ بہار ہے آم

ایک دن میں پلنگ پر لیٹا ہوں کہ ناگاہ چراغ دودمان علم و یقین سید نصیر الدین آیا تو ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ اس کے سر پر ٹوکرا دھرا اس پر گھاس ہری بچھی میں نے کہا اہا سلطان العلما ر مولانا سرفراز حسین دہلوی دوبارہ رسد — بارے معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہیں یہ کچھ اور ہے فیض خاص نہیں لطف عام ہے یعنی شراب نہیں آم ہے خیر یہ عطیہ بھی بے خلل ہے بلکہ نعم البدل ہے ایک ایک کو سربمہر گلاس سمجھا لکورے بھرا مگر واہ کیسی حکمت سے بھرا ہوا ہے کہ ۶۵ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا ہے۔

اچھا اب چلتا ہوں دیر ہوگئی کہیں غیر حاضری نہ لکھ دیں اور بھگوڑوں میں شامل نہ کر دیں۔ آخر فرشتے ہیں انھوں نے پہلے کیا کیا کہ اب خیر کی توقع کروں —

الف: بس ایک آخری سوال —

غالب: کہو کہو — جلدی سے کہہ ڈالو! —

الف: آپ نے اپنی شاعری اور تصنیف کے متعلق کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔

غالب: ہونہہ — اچھا یہ بھی سن لو — خاکسار نے ابتدائے سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی تھی پھر اوسط عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہوکر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی — نظم و نثر کا عاشق و مائل ہوں ہندوستان میں رہتا تھا مگر تیغ اصفہانی کا گھائل تھا۔ جہاں تک زور چل سکا فارسی زبان میں بہت بکا ایک اردو کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا ایک فارسی کا دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا تین رسالے نثر کے

یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے پھر سوچا اب اور کیا کہوں گا۔ مدح کا صلہ نہ ملا۔ غزل کی داد نہ پائی، ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی، گیارھویں مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد نثر میں بہ عبارت فارسی ناآمیختہ بہ عربی لکھی اور وہ ۱۵۰ سطر کے مسطر سے چار جز کی کتاب آگرہ کے مطبع مفید خلائق میں چھپی دستنبو اس کا نام رکھا اور اس میں صرف اپنی سرگزشت اور اپنے مشاہدے کے بیان سے کام رکھا۔

زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے ہی متروک کر دیا تھا پیرانہ سالی اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہ رہی حرارت غریزی کا زوال تھا اور یہ حالت:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب   اب عناصر میں اعتدال کہاں

(ایک آواز دور سے سنائی دیتی ہے)

آواز: مرزا اسداللہ خاں دہلوی حاضر ہووے۔

غالب: اچھا خدا حافظ ـــ عالم آب و گل کے رہنے والوں کو سلام پہنچا دینا۔

الف: ضرور ضرور ـــ انشاءاللہ ـ مگر زحمت ہوئی آپ کو۔

آواز: مرزا اسداللہ خاں غالب حاضر ہووے۔

غالب: حاضر ـــ حاضر (چلتے چلتے) خدا حافظ ـ خدا حافظ ـــ

اب کہاں وہ لوگ ـ چاٹ گئی یہ زمین ـــ

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

سراج احمد علوی

غالب جنّت میں

غالب کی موت

پس منظر: ایک سہ درہ دالان ہے جس کے سامنے ایک بڑا صحن ہے دالان کے دروں میں اندرونی جانب پردے آدھی محراب تک بندھے ہوئے ہیں۔ دالان کے وسط میں ایک پلنگ ہے جس کا سراہنا شمال کی سمت ہے، پلنگ پر گدّا بچھا ہوا ہے۔ اور سفید چادر چاروں طرف کلابتوں کی ڈوریوں سے پایوں میں بندھی ہوئی ہے۔ پلنگ سے ملا ہوا تختوں کا چوکا ہے جس پر دری بچھی ہوئی ہے اور اس پر صاف فرش ہے جو چاروں کونوں پر میر فرشوں سے دبا ہے۔ صدر میں بڑا گاؤ تکیہ قرینے سے رکھا ہے۔ سامنے صاف اگالدان رکھا ہے، اگالدان سے کچھ اوپر پلنگ سے نزدیک خاصدان رکھا ہے۔ پلنگ سے قریب تخت پر ایک لکڑی کا سربند قلمدان رکھا ہے جس کے اوپر بہت نفیس تار کا کام کیا ہوا ہے ایک کاغذ گیر میں خط لکھنے کا کاغذ دبا ہوا پاس ہی رکھا ہے۔

پلنگ کے داہنے جانب کچھ پرانے قسم کے مونڈھے رکھے ہوئے ہیں جن پر حالی، شیفتہ، حکیم احسن اللہ خاں ثاقب اور نواب ضیاء الدین احمد خاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ غالب پلنگ پر عمدہ چھینٹ کی رضائی اوڑھے لیٹے ہیں دونوں گھٹنے کھڑے ہیں۔ پورا جسم ڈھکا ہے صرف چہرہ کھلا ہے آنکھیں نیم وا ہیں۔ بے ہوشی کی سی کیفیت ہے حلق سے خرخر کی آواز برابر آ رہی ہے۔ سرہانے ایک نوکر چارخانے کا بڑا رومال لیے مکھیاں جھل رہا ہے۔

یکایک زور کی خرخر کے ساتھ غالب چونکتے ہیں اور آنکھیں کھول دیتے ہیں۔ حالی نے آگے بڑھ کر ایک پرچہ پیش کیا۔ نواب علاء الدین خاں لوہارو کا خط استفسار حال و طلب خیریت کا تھا۔ کاغذ کچھ دیر سامنے کیے رہے، بے نور آنکھوں نے صفحہ کو دیکھا ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی، زور سے کھنکارا ذرا گردن اٹھائی، احسن اللہ خاں کی طرف دیکھا وہ اٹھ کر تخت پر آئے کاغذ گیر سے کاغذ نکالا قلمدان سے کلک کا قلم نکالا، انگیٹھے پر اس کا قط جانچا اور گھٹنے پر کاغذ رکھ کر لکھنے کو تیار ہو گئے۔ غالب نحیف آواز میں بولے لکھو:

"مرزا علائی ۔ گماں زیست بود برمنت زبیدردی
بد است مرگ و لے بدتر از گماں تو نیست

میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو، ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔
۔ نہ کردہ ہجر مدارا بہ من سر تو سلامت!

از کار رفتہ و درماندہ ہوں (رک کر) یہ مصرعہ چپکے چپکے پڑھتا ہوں۔
"اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے؟"

رضوان: تو پھر ارادہ کیا ہے؟

غالب: خوب یہ آپ کا تجاہل عارفانہ ہے آپ کے پاس بھیجا کس لیے گیا ہوں کہ آپ مجھے جنت کی سیر کرائیں۔

رضوان: مگر تم تو دنیا میں جنت کو دوزخ میں جھونک دینے پر آمادہ تھے۔

غالب: ہائے ہائے جو رونا مجھے دنیا میں تھا وہی یہاں بھی ہے واہ ری قسمت!

رضوان: (پیچ و تاب کھا کر) اس جملے کے کیا معنی؟

غالب: جب تک دنیا میں رہا اس غم میں خون جگر کھایا کیا کہ میرا کلام نہ لوگوں کی سمجھ میں آیا اور نہ انھوں نے سمجھنے کی کوشش کی اس خیال سے کچھ کچھ تسلی ہو جایا کرتی تھی کہ خیر یہاں نہ سہی عالم ارواح میں قدسیوں سے داد کلام پاؤں گا مگر دیکھتا ہوں تو یہاں بھی ایں خانہ تمام آفتاب است کا مضمون نظر آتا ہے۔

رضوان: (اس جواب سے کچھ جز بز ہوئے اور ذرا رک کر بولے) خیر تمہیں جنت میں تو لیے چلتا ہوں مگر جس فکر میں آپ جا رہے ہیں وہ کہیں نام کو بھی نہیں ملے گی اس سے جمع خاطر رکھیے۔

غالب: آپکی یہ چیستانی تقریر تو میری سمجھ میں آئی نہیں اس معمہ کو آپ ہی حل فرمائیں۔

رضوان: (جھنجلا کر) یہ شعر تمہارا نہیں ہے؟

غالب: کونسا شعر؟

رضوان: یہی کہ: وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

غالب: جی شعر تو میرا ہے لیکن میں نے آپ سے بادۂ گلفام کی درخواست کی ہوتی تب آپ کہتے اس قبل از مرگ واویلا کے کیا معنی؟

رضوان: (لاجواب ہو کر) اچھا خیر چلو مگر ایک بات کا وعدہ کرو کہ سیر باغ کے بعد

کوئی آئیں بائیں شائیں رائے نہیں دوگے۔

غالب: آپ کو یہ شبہ کیسے پیدا ہوا؟

رضوان: بات یہ ہے کہ تمہارے اس شعر سے مترشح ہوتا ہے:

کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ
خلد بھی باغ ہے خیر آب وہوا اور سہی

کہ تم اسے بھی ارضی باغوں کا سا سمجھتے ہو۔

غالب: (جھلا کر) میں سیر جنت سے درگزرا آپ تو نکاح کی سی شرطیں قبولوا رہے ہیں۔ (ایک طلائی کارڈ بڑھاتے ہوئے) لیجئے پروانہ جنت میں ان پابندیوں کے ساتھ جنت میں داخل ہونے سے درگزرا۔

(یہ کہکر چلنے کے لیے مڑتے ہیں)

رضوان: ٹھہرو! ٹھہرو!! بات صرف اتنی ہے کہ تم آدمی ذرا مخدوش ہو اس لیے مجھے اتنی حفاظتی تدابیر اختیار کرنا پڑیں۔ ورنہ میں تو بلا ایک لفظ کہے لوگوں کو جنت میں داخل کردیا کرتا ہوں میرا بس چلے تو میں تم کو ہرگز بہشت کے اندر قدم نہ رکھنے دوں مگر حکم حاکم مرگ مفاجات اور حکم بھی رب العالمین کا سرتابی کی مجال نہیں —— اچھا چلو۔

(غالب اور رضوان ساتھ ساتھ دروازے میں داخل ہوتے ہیں غالب نے محاکمانہ نظر سے ہر چیز کو دیکھنا شروع کیا اور رضوان کے ساتھ ادھر ادھر گھومتے رہے بشرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنت زیادہ پسند نہیں آئی ان کی نظر ٹہلتے ٹہلتے دور پر چمکتے تند و تیز شعلوں پر پڑتی ہے)

غالب: یہ تیز روشنی کیسی ہے۔

رضوان: نارِ دوزخ کا التہاب ہے۔

غالب: (بغیر سوچے سمجھے عرش کی طرف سر اٹھا کر) بارِ الٰہا! تو نے اپنے کرمِ بے پایاں اور رحمتِ لامتناہی کے صدقے مجھ گنہ گار کو وہ کچھ عطا کیا جس کا میں کسی طرح اہل نہیں تھا، ایک آخری آرزو میری اور پوری ہو جائے۔

ندائے غیبی: اب کیا چاہتا ہے۔

غالب: ؎ کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لوں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

ندائے غیبی: نادان تیری جو بات ہے نرالی ہے۔ تیری یہ آرزو پوری ہونے سے کیوں رہ جائے جا اور اپنی احمقانہ خواہش کا تماشا دیکھ۔

(دوزخ کے شعلے آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں پہلے تو غالب نہایت ذوق و شوق سے ان کے رقص و تموج کا تماشا دیکھتے رہے مگر جب شعلے قریب ہوتے گئے تو غالب تپش اور التہاب سے پریشان ہونے لگے شعلے اور قریب آئے، غالب حدت سے گھبرا کر سجدے میں گر پڑے اور گڑگڑا کر چیخنے لگے)

غالب: بارِ الٰہا بس مجھ میں ان شعلوں سے کھیلنے کی تاب نہیں میں اپنی احمقانہ خواہش سے بھر پایا۔ جان آفرینا مجھے اس عطیے سے معاف رکھ
(گرمی سے غالب بے ہوش ہو جاتے ہیں، اور شعلے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔)

سید وقار عظیم

غالبؔ اپنے شارحین کیساتھ

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب کے انتقال کو آج پورے ۹۳ برس ہوئے لیکن اس ۹۳ برس کی دوری نے مرزا کو ایک لمحہ کے لیے بھی اہل نظر کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ غالب زندہ تھے، جب بھی ان کا کلام چشم بصیرت کا سرمہ تھا اور اب بھی جب کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں دل نے اسے ایک سرمایۂ عزیز سمجھ کر اپنی دھڑکنوں کا ہم نوا بنایا ہے ـــــ مرزا کا ذکر جمیل ہر بزم کے لیے سبب انجمن آرائی اور ان کی فکر جلیل ہر قلب کے لیے موجب دل کشائی ہے فلسفہ اور تصوف کا نام بھی اس کے دم سے روشن ہے اور شعر و سخن بھی اس کی بدولت شعر و سخن ہے مرزا کا شعر دلبری و دلستانی کے جہاں کی رونق بھی ہے اور بزم طرب و نشاط کی گہما گہمی بھی اس کی مرہون منت ہے اور آج بھی ہم غالب کے دیکھے ہوئے خوابوں کی تعبیریں ڈھونڈنے اور اس کی کتاب دل کی تفسیریں لکھنے کو اپنے وقت کا بہترین مصرف جانتے ہیں ـــــ آج بھی تصور اس اجڑی ہوئی محفل کے نقشے جمانے میں مصروف و سرگرداں ہے اور آج بھی دل اس کی اُس نکتہ دانی اور رنگ افشانی کی لذتوں کے لیے بے قرار ہو کر تصور کی اس بزم آرائی میں اس کا شریک ہے اور تصور کی بزم آرائی اور دل کی ناشکیبائی نے

ایک نقشہ جمایا ہے یہ عالم برزخ ہے

عالم برزخ میں ایک صبح دلکشا بلی ماراں والے دیوان خانے سے ملتے جلتے ایک دیوان خانہ کا ایک حجرہ شمال کے رخ سہ دری کے تین در، مشرق کی طرف ایک جھروکا مرزا چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں مشرقی جھروکے سے سورج کی کرنیں داخل ہو رہی ہیں اور مرزا کے سر پر رکھی ہوئی ململ کی ٹوپی کی کامدانی جھلمل جھلمل کر رہی ہے مرزا جیسے عالم استغراق میں ہیں کلیان دبے پاؤں داخل ہوتا ہے اور چلم پیچوان پر رکھ کر واپس چلا جاتا ہے مرزا آنکھیں کھولتے ہیں اور پیچوان کی نے ہاتھ میں لے کر حقہ گڑگڑانے لگتے ہیں اور ساتھ ساتھ ہلکے ترنم کے ساتھ یہ شعر پڑھتے جاتے ہیں۔

نہ شام ما را سحر نویدی نہ صبح ما را دم سپیدی
چو حاصل ماست نا امیدی غبار دنیا بفرق عقبیٰ

پھر حقہ گڑگڑانے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ اپنے آپ سے کہنے لگتے ہیں۔

وہ دنیا ختم ہوئی یہ دوسری دنیا ہے اُس دنیا میں آدمی کثرت غم سے سودائی بنتا ہے اور یہاں عالم برزخ میں امید و بیم کے درمیان معلق ہے (آہ سرد کھینچ کر) مرزا بیدل کا یہ شعر اُس دنیا میں جو مزہ دیتا تھا اس سے زیادہ مزہ آج دنیا ہے۔

نہ شام ما را سحر نویدی نہ صبح ما را دم سپیدی

(اتنے میں کسی کے اندر داخل ہونے کی آہٹ ہوتی ہے مرزا بولتے ہیں)
کیوں میاں کلو کیسے کھڑے ہو۔

کلو: سرکار! وہ مولانا خیر آبادی تشریف لائے ہیں۔
غالب: (حیرت سے) کون؟ مولانا خیر آبادی تشریف لائے ہیں۔
کلو: جی ہاں سرکار! وہی جن کے ساتھ ....

غالب: (خوشی سے) اچھا وہ بھی تشریف لائی ہیں ارے تو بھائی تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ بلا دینا انہیں اندر جلدی سے

کلّو: جو حکم!

غالب: (آہستہ آہستہ کہتے ہیں) یا اللہ۔ راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں ہر دم دروازے پر نظر تھی کہ وہ میر مہدی آئے وہ میر سرفراز حسین آئے وہ یوسف مرزا آئے وہ میرن آئے وہ یوسف علی خاں آئے آج اللہ نے میری سن لی۔

آواز: ارے صاحب، ہم اندر آئیں؟

غالب: (بے تابی سے) ارے صاحب! آ بھی چکو کہیں بڑی ہی راہ دکھائی آؤ ادھر آؤ مولوی صاحب میرے سینے سے لگ جاؤ۔ اللہ اللہ آج ۹۳ برس کے بعد یہ دن دیکھنا نصیب ہوا نہ وہ دلّی رہی نہ دلّی والے کہاں ہیں وہ مفتی صدر الدین آزردہ اور کدھر ہیں وہ منشی نبی بخش حقیر اور وہ ہمارے مولانا فضل حق خیر آبادی۔

فضل حق: ارے بھائی! میں تو یہیں ہوں۔

غالب: (خوش ہو کر) ہاں ہاں تم تو یہیں ہو، اور وہ میر مہدی، وہ میرن، یہ سب آخر کہاں گئے؟ بس نہیں چلتا کہ قیامت تک تمہیں سینے میں چھپا رکھوں مگر بھائی یہ کیا۔ یہ کیا! دیوانگی ہے آخر؟ وہ بے چاری دم بخود کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی ہیں......... آؤ صاحب یوں چپ چپ کیوں کھڑی ہو بیٹھو کچھ اپنی کہو کچھ ہماری سنو!

نوابی آواز: مرزا صاحب! میرا تو جی چاہتا ہے کہ بس کھڑی یہ تماشا دیکھتی رہوں یونہی دو دوست گلے ملتے رہیں یونہی شکوے ہوں اور یوں ہی یہ رسم محبت

جاری رہے۔

غالب: ارے صاحب! تم نے تو شاعری شروع کر دی۔ یہ ناحق تمہیں اللہ نے ایک مولوی کے پلّے باندھا (اس پر سب ہنستے ہیں) آؤ چلو ادھر بیٹھو، ہاں یوں آرام سے۔

فضل حق: کیوں بھائی! یہ تو فرمائیے کہ آخر یہاں گزرتی کیسی ہے؟

غالب: (ہنس کر) گزرتی کیسی ہے؟ غالب علیہ الرحمۃ کی جیسی ہمیشہ گزری اب بھی گزر رہی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ اب ہر نعمت بے مانگے ملتی ہے بے منت مختار ملتی ہے۔ یہاں متھرا داس، درباری مل اور خوب چند کا دھڑکا نہیں ــــ صبح کو مقشر باداموں کی ٹھنڈائی دوپہر کو بے ریشہ نرم اور لذیذ گوشت مرغ کبوتر، بٹیر اور حسب طلب کڑوے کریلے۔ گوشت میں چنے کی دال کہ اللہ میاں کا من بھاتا کھاجا ہے اور بگا بیگم کا ڈر بھی نہیں۔

نسوانی آواز: اور حضرت؟

غالب: (شگفتگی کے ساتھ) اور حضرت! یہ قاضی کے گھر کے چوہے بھی بڑے سیانے ہوتے ہیں مطلب یہ ہے کہ حضرت وہ چیز یہاں نہیں ملتی جس کا حال آپ پوچھ رہی ہیں۔ وہ عرق جس سے قویٰ میں سکت اور ذہن میں تیزی آتی ہے یہاں نہیں ہاں آم ہیں انگور ہیں اور کلو دار وغیرہ ہے کہ اسی کی بدولت عرق "خانہ ساز" کے چند جرعے میسر آجاتے ہیں۔

فضل حق: اور پھر اور کیا چاہیے آپ کو؟

غالب: (ہنس کر) تمہیں تو سچ مچ یہاں بھی کچھ نہیں چاہیے اللہ کی یاد اور صحفت رخ کا دیدار (دنیا بھی اپنی عقبیٰ بھی اپنی رہتے ہوئے) لیکن میرے دل سے پوچھو کہ مجھے یہاں کیا چاہیے نہ دوست نہ آشنا جس سے خطوں

کے ذریعے جینا اپنی عادت بنالی ہو اس کے پاس نہ کسی کا خط آتا ہے اور نہ وہ کسی کو لکھ سکتا ہے اور پھر یہ بھی پتا نہیں کہ اس آج کی کل کب ہوگی قیامت کی گھڑی کا انتظار یوں ہے جیسے وصل محبوب کا دنیا میں جو شعر میرے حسب حال تھے وہ اس عالم برزخ میں اور بھی مزہ دیتے ہیں صبح کو شام اور شام کو صبح کرنا سچ مچ جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔

فضل حق: لیکن یہ آپ کو روز جزا کا اتنی بے تابی سے آخر انتظار کیوں ہے؟

غالب: بس اسی بھروسے پر کہ شاید ناپرسیدہ بخش دیا جاؤں۔

فضل: (ہنس کر) اور وہ جنت مسکن بنے جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہیں؟

غالب: (ہنس کر) ارے نہیں مولوی! تم بھول گئے بہشت مجھے حوروں کے لیے نہیں کسی اور چیز کے لیے عزیز ہے۔

فضل حق: سچ ہے بھائی صاحب! یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔

نسوانی آواز: یہ آپ نے کہاں کا قصہ چھیڑ دیا۔

غالب: ارے صاحب تم یہ تو بھول ہی گئے کہ آپ یہاں تشریف فرما ہیں بھئی مجھے ایک بات یاد آئی یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں بیاض نہیں رکھتا اور حافظہ ایسا ہے نہیں کہ کلام زبانی یاد رہے اس تنہائی میں لے دے کر بس ایک غزل ہے جو یاد آتی ہے اور سارے وقت نا وقت گنگناتا رہتا ہوں آج آپ یہاں ہیں تو جی چاہتا ہے کہ غزل کے چند شعر آپ سے سنوں۔

نسوانی آواز: فرمائیے وہ کونسی غزل ہے۔

غالب: وہی جس کی ردیف "بگردانیم" ہے۔

فضل حق: واہ! غزل بھی خوب جی میں سمائی ہے

غالب: ہاں! بس یہ عالم تنہائی کبھی کبھی ایسا مزہ دیتا ہے کہ کسی سے کچھ تعلق

رکھنے کو جی نہیں چاہتا اور جب جی چاہے تو زبان بھی جی کا ساتھ دینے لگتی ہے۔

فضل حق: تو صاحب! مرزا صاحب کی یہ خواہش پوری کر دیجے۔

نسوانی آواز: بہت خوب، آپ حقہ کا ایک کش لیجے، میں غزل شروع کرتی ہوں۔

فضل حق: (حقہ کا کش لے کر) حقہ بھی اس وقت کیا مزہ دے رہا ہے۔

نسوانی آواز: (معمولی وقفہ کے بعد گانا شروع کرتی ہیں)

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم — قضا بگردش رطل گراں بگردانیم
اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم — وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہمزباں سخن نہ کنیم — وگر خلیل شود میہماں بگردانیم
بجنگ باج ستاناں شاخسار ی را — تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم
بصلح بال فشاناں صبح گاہی را — ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم

ز حیدریم من و تو ز ما عجب نہ بود
گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

(غزل ختم ہوتی ہے پڑھنے والی کو داد ملتی ہے کہ اتنے میں آہٹ ہوتی ہے آہٹ سن کر غالب بولتے ہیں)

غالب: کیوں کلّو کیا بات ہے؟

کلّو: سرکار وہی پانی پت والے خواجہ صاحب تشریف لائے ہیں۔

غالب: (خوش ہو کر) کون؟ میر مہدی آ گئے، میرا مہدی!

کلّو: نہیں سرکار وہ جو گلے میں رومال باندھتے ہیں۔

فضل حق: ارے بھئی وہ الطاف حسین ہوں گے۔

کلّو: جی ہاں سرکار! وہی ہیں اور ان کے ساتھ ایک بڑے میاں بھی ہیں۔

غالب: دیکھا چاہیے کہ یہ بڑے میاں کون ہیں؟ ارے بھئی ہم اس لطف صحبت میں یہ بتانا بھول گئے کہ آج اس وقت کئی بزرگ ایسے تشریف لا رہے ہیں جنہوں نے میرے مرنے کے بعد مجھے رسوا کیا ہے۔

فضل حق: یعنی؟

غالب: یعنی یہ کہ میرے کلام کی شرحیں لکھ کر اسے کیا سے کیا بنایا ہے ۔۔ اچھا ہوا کہ آج تم بھی آ گئے ذرا لطف رہے گا۔ صاحب آپ ذرا دوسرے حجرے میں جا کر آرام کیجئے۔ کلّو ان دونوں صاحبوں کو اندر بلا لو۔

کلّو: بہت اچھا سرکار،

غالب: اور کلیان سے کہو ذرا ایک چلم اور بھر دے۔

کلّو: جو حکم۔

غالب: (حقہ گڑگڑانے کے بعد) میرے شعروں کے معنی اگر کسی نے سمجھے تو منشی نبی بخش حقیر نے یا پھر اس پانی پت والے نے۔

(تینوں اندر آتے ہیں)

حالی: قبلہ و کعبہ! تسلیم۔

دوسری آواز: صاحبو! آداب بجا لاتا ہوں۔

غالب اور فضل حق: آداب، تسلیمات۔

غالب: (حالی سے) میاں حالی آپ کی تعریف۔

حالی: قبلہ! یہ "وثوق صراحت" والے، مولوی عبد العلی والہ دیوان غالب اردو کے پہلے باقاعدہ شارح۔

غالب: میاں! یہ "وثوق صراحت" مولوی صاحب قبلہ کے قصیدوں کا مجموعہ ہے کیا؟

عبدالعلی: (لجاجت سے) قبلۂ و کعبہ اس بندۂ ہیچ مداں کو ان شہنشاہ اقلیم سخن کی ذات بابرکات و کلام بلاغت نظام سے جو عقیدت ہے اس کی تصویر صفحۂ قرطاس پر کھینچنے کی جسارت کی ہے اور اس جسارت کا نام "وثوق صراحت" رکھا ہے۔

حالی: حضرت! مولوی صاحب کی شرح غالب کا تاریخی نام "وثوق صراحت" ہے۔

غالب: مولانا! عجب اتفاق ہے کہ یہ شرح میری نظر سے نہیں گزری۔

عبدالعلی: اس لیے یہ بندۂ ناچیز اس جسارت بے جا کا ایک نسخہ حضور کی نذر کی غرض سے ساتھ لایا ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

برگ سبز است تحفۂ درویش۔ جی ہاں! اسی لیے میں نے اس کتاب پر سبز جلد بندھوائی ہے۔

غالب: بھائی! آپ کے اس ارمغاں کو ہدیۂ خلوص و محبت جانتا ہوں اور دل سے اس کا قدردان ہوں۔

عبدالعلی: اس قدردانی کو یہ بندۂ ہیچ میرز قدر افزائی کے مرادف جانتا ہے لیکن جہاں میرے ارمغاں کو شرف قبول بخشا گیا ہے ایک ادنیٰ سی درخواست یہ بھی ہے کہ اس خاک پائے شاعران نغز گفتار نے اشعار کے جو مطالب لکھے ہیں ان میں سے بعض کو نظر نوازی کا شرف بھی عطا فرمایا جائے۔

(اتنے میں باہر سے کچھ ملی جلی آوازیں آتی ہیں — لوگ ان آوازوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں)

حالی: شاید دوسرے حضرات تشریف لے آئے اجازت ہو تو میں جا کر دیکھوں۔

غالب: ہاں میاں ضرور!

(حالی باہر جاتے ہیں اور مرزا حقہ گڑ گڑاتے ہیں)

فضل حق : حقہ تو اس وقت بڑے مزے میں آرہا ہے مولانا آپ شوق نہیں فرماتے!

عبدالعلی : جی، بندہ اس نعمت عظمیٰ سے محروم ہے۔

(اتنے میں کئی آدمی اندر داخل ہوتے ہیں اور مختلف طریقوں سے سلام کرتے ہیں آداب عرض ہے حضور! تسلیمات! مزاج اقدس! السلام علیکم! کی ملی جلی آوازیں)

(حالی باری باری سے سب کا تعارف کراتے ہیں)

حالی : حضور! آپ سید علی حیدر نظم طبا طبائی ہیں۔

طبا طبائی : تسلیم عرض ہے۔

حالی : اور آپ ہیں مولانا عبدالباری آسی۔

آسی : آداب عرض ہے۔

حالی : اور جناب ..... حسرت۔

حسرت : خاکسار حسرت موہانی۔

حالی : اور جناب ہیں حضرت بیخود دہلوی۔

بیخود : آداب عرض۔

غالب : صاحبو! تمہاری مہربانی کا کیسے شکریہ ادا کروں کہ میری تنہائی پر ترس کھایا اور یہاں تشریف لائے آپ سے پہلے یہاں جو صاحبان موجود ہیں ان سے ملیے ـــــ میرے دوست مولانا فضل حق خیرآبادی۔

حسرت : اخاہ!

غالب : (سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے) اور آپ ہیں مولانا عبدالعلی۔

حسرت : اچھا وہ "ذوق صراحت" والے!

طباطبائیؔ : مولانا ذرا ٹھہریئے مجھے بڑا اشتیاق تھا مولانا سے ملنے کا۔

عبدالعلی : (لجاجت سے) جی بندہ!

طباطبائیؔ : جی بندہ کیا معنی؟ مولانا گستاخی معاف ہو، یہ آپ نے شرح غالب لکھنے کی زحمت ....

عبدالعلی : جی نہیں قبلہ! زحمت کیسی وہ تو باعث عین رحمت ہے۔

فضل حق : جناب من آپ کے تشریف لانے سے پہلے یہی مذکور تھا، مولانا نے جو شرح تحریر فرمائی ہے اس کے متعلق آپ کا ارشاد بلکہ یوں کہیے کہ آپ کی خواہش یہ ہے کہ اس کے دو ایک شعروں کے مطالب کی طرف آپ توجہ فرمائیں۔

طباطبائیؔ : تو قبلہ اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں ذرا وثوق صراحت سب مجھے عنایت ہو۔

غالب : یہ لیجیے۔

طباطبائیؔ : سب سے پہلے سر دیوان کی شرح ملاحظہ ہو، شعر ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

مولانا فرماتے ہیں، پیرہن کاغذی = فریادیوں کا لباس جو قدیم میں دستور تھا یہ کنایہ ہے عجز و بے چارگی و تظلم و زاری سے۔

آسی : جی! طباطبائیؔ صاحب قبلہ!

طباطبائیؔ : جی کیا؟ مطلب تو ختم ہوا۔

آسی : بڑا اختصار فرمایا ہے مولانا نے۔

طباطبائیؔ : اجی حضرت اختصار یہ نہیں ہے اختصار کے مفہوم کی وضاحت تو

آگے چل کر ہوتی ہے۔ (کچھ ورق الٹ کر) مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

مولانا فرماتے ہیں ہیولی یہ مادہ۔

فضل حق: کیوں جناب آپ خاموش کیوں ہو گئے؟

طباطبائیؒ: اس لیے کہ اس کے آگے مولانا خود خاموش ہیں اس شعر کا صرف یہی مطلب ہے۔

عبدالعلی: حضرت آپ نے تو موشگافیاں شروع فرما دیں اور مجھ ناچیز نے یہ شرح طلبار کے لیے لکھی ہے آپ جیسے فضلار کے لیے نہیں۔

طباطبائیؒ: اور اسی لیے کبھی کبھی "صنعت ایجاز" کے بجائے "صنعت حشاکلہ" کا صرف فرمایا ہے یعنی شرح کی عبارت خود ایک شارح کی محتاج ہے۔

حسرت: وہ کیسے حضرت؟

طباطبائیؒ: مولانا آپ آخر یہ تجاہل عارفانہ کیوں فرما رہے ہیں بہرحال میرے اس اجمال کی تفصیل یہ حضرت مرزا کا شعر ہے:

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

مولانا فرماتے ہیں: رہ گزر مذکور میں جو بیشتر نزاکت موفور کے سبب جلوۂ گل باعث کدورت تھا اب عاشقی میں اس دل و جگر کا یہ حال ہے۔

پامال دو صد قافلۂ خون است دریں راہ
آں دیدہ کہ از سایہ مژگاں گلہ دارد

غالب: ارے صاحبو! اللہ اللہ کرو خانۂ غالب کو یوں مداری کا اکھاڑا مت

بناؤ ایک سیدھے سادے بڈھے سے اگر غالب کو سمجھنے اور سمجھانے میں
میں کوتاہی ہوئی ہے تو یوں اس کی گت نہ بناؤ خود اپنے گریبان میں منہ
ڈالو اور دیکھو کہ تم نے کیا کیا ہے۔ اس لیے کہ میرا خیال تو یہ ہے کہ سب
شارح راہ سخن کے غول ہیں۔ آدمی کے گمراہ کرنیوالے۔

طباطبائی: حضرت! مجھے خود بینی اور خودستائی کا احتمال نہیں لیکن میں نہ اپنی
شرحوں کو آدمی کے لیے گمراہ کن جانتا ہوں اور نہ مجھے یہ تسلیم ہے کہ میں
راہ سخن کا غول ہوں — سخن فہمی سخن سنجی میری گھٹی میں پڑی ہے اور اس
بات کو اپنے لیے سرمایۂ ناز سمجھتا ہوں۔ اور اسی لیے کسی شعر کی شرح کروں
تو صرف یہ لکھ کر خاموش نہیں ہو جاتا کہ ہیولیٰ یعنی مادہ۔

حسرت: ہاں تو آپ نے اس شعر کی شرح کس طرح فرمائی ہے اس وقت
میرے ذہن میں نہیں حضرت!

طباطبائی: معنی صاف ہیں طبع رسا شرط ہے — یعنی میں وہ دہقاں ہوں
جس کی سرگرمی خود اس کے خرمن کے لیے برق کا کام کرتی ہے یعنی خرمن
کو جلائے ڈالتی ہے یہ اشارہ اس بات کی طرف کہ حرارت غریزی جو
کہ باعث حیات ہے خود ہی ہر وقت تحلیل و فنا بھی کر رہی ہے۔ ہیولیٰ
بمعنی مادہ اور مصنف نے صورت کی لفظ ہیولیٰ کی مناسبت سے
استعمال کی ہے اور تعبیر سے تعمیر خاکی مقصود ہے۔ خون گرم بمعنی سرگرمی
حضرات اس شعر میں جو مسئلہ طب مصنف نے نظم کیا ہے آگے بھی کئی
جگہ باندھا ہے،

غالب: اے صاحب سبحان اللہ، ماشاء اللہ شعر کا مطلب خوب بیان فرمایا پر
تمہیں کہتے خدا کا خوف نہ آیا کہ میں نے اس شعر میں بھی مسئلہ طب نظم کیا ہے

اور اسے آگے بھی کئی جگہ باندھا ہے اگر میری ما نو یہ مجھ پر اتہام ہے میں طبیب ہرگز نہیں اور نہ طب کے مسئلے اپنے شعروں میں نظم کرتا ہوں ۔ میں کچھ نہیں بس ایک شاعر ہوں اور شاعری کے ساتھ ایک مناسبت ازلی و سرمدی لایا ہوں اگر مجھے اس کے سوا کچھ جانتے ہو تو مجھ پر بہتان دھرتے ہو اور دنیا کو گمراہ کرتے ہو اب تم ہی بتاؤ کہ کوئی حور یا فرشتہ تمہاری شرح پڑھ کر مجھے طبیب سمجھ لے اور کل کو مجھ سے اپنے کسی مرض جسمانی کی دوا طلب کرے تو میں کہاں جاکر چھپوں گا کس طرح زندگی کے باقی دن کاٹوں گا ۔

(آخری فقرے پر اہلِ مجلس میں ہلکی ہلکی ہنسی کی آواز)

آسی : تو حضرت ! آج آپ نے فرما دیا کہ میں طبیب نہیں کل یہ ارشاد ہوگا کہ فلسفی اور صوفی نہیں تو دنیا ہماری کہی ہوئی باتوں کو خفقان کے سوا اور کیا سمجھے گی ؟

غالب : بھائی دنیا تمہیں جو کچھ سمجھے گی ، اس میں دخل دینے والا میں کون ؟ جیسا کرو گے ویسا بھگتو گے (عام ہنسی) ، لیکن اگر تمہارا ماخذ صحیح اور طبع سلیم ہے تو کسی شرابی کو صوفی اور شاعر کو فلسفی کہہ کر کیوں رسوا ہوتے ہو ، اور کیوں دوسرے کو رسوا کرتے ہو ۔

آسی : لیکن جناب آپ کے شعر تو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ آپ صوفی بھی ہیں اور شاعر بھی ۔

غالب : شعر بے چارہ تو کچھ بھی نہیں کہتا آپ ہی اس سے جو چاہیں کہلوا لیں ، وہ بے بس ، بے زبان ، آپ نے اس کے کان اینٹھے اور اس سے پوچھا "بول غالب صوفی ہے ؟" وہ غریب اپنی جان بچانے کو بول اٹھا "جی ہے" پھر پوچھا "بول غالب فلسفی ہے ؟" مجبور ہو کر کہہ دیا "جی ہے" آج اس سے غالب کو صوفی طبیب اور فلسفی کہلوایا ہے کل کچھ اور جی

ہیں آئے وہ کہلوا لینا ـــــ لیکن لوگو! انصاف شرط ہے اگر غالب یہ سب کچھ ہے تو شاعر کب ہوا؟ اب تم ہی سوچو کہ تم غزل نہیں تو کیا ہو آدمی کو گمراہ نہیں کرتے تو آخر کیا کرتے ہو! داد داد! انصاف انصاف!

طباطبائی: حضرت گستاخی معاف! آپ کی یہی خود سری و خود پسندی ہے جس نے آپ کی زندگی کو سدا ناز یبا ہنگاموں کا مرکز بنائے رکھا آپ اگر سچ مچ انصاف کے طالب ہیں تو آپ کو اپنے شارحین کا احسان مند ہونا چاہیے کہ انھوں نے طرح طرح کی تاویلوں سے آپ کو بزم شعر کی سروری دلوائی ـــــ حالی، آزاد بجنوری، حسرت اور طباطبائی نے غالب کو غالب بنایا ہے ورنہ غالب تو بس یہ کہتے رہتے کہ "فارسی بیں! فارسی بیں" اور زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا اور غالب کا بھی وہی حال ہوتا جو شاہ نصیر کا ہوا۔

(اس دوران میں مجمع سے آہستہ آہستہ ناپسندیدگی کی آوازیں نکل رہی ہیں اور طباطبائی کی آواز میں برابر تیزی بڑھتی جاتی ہے اس کے بعد مولوی فضل بولتے ہیں)

فضل حق: (غصے سے) قبلہ! بس اب اپنی زبان کو لگام دیجیے

غالب: ارے مولوی تمھیں غصہ آگیا (ہنس کر) ان بے چاروں کو جی کی بھڑاس نکال لینے دو، خوش ہو لینے دو، غالب کی بدولت دو چار آدمی ان کا نام عزت سے لینے لگے ہیں تو اس پہ خاک مت ڈالو ـــــ سوچو تو کہ طباطبائی کو کون جانتا اگر اس نے غالب کے دیوان کی شرح نہ لکھی ہوتی؟ اگر اپنی شرح میں غالب کو یوں مطعون نہ کیا ہوتا؟ اور اگر یوں شرح لکھتے لکھتے بزعم خود میرے کلام پر اصلاح دینے کی کوشش نہ کی ہوتی۔

حسرت: حضرت! یہ تو واقعی صحیح ہے کہ نواب صاحب نے آپ کے شعروں

اور مصرعوں پر اصلاح دے کر.......

عبدالعلی (بیتابی سے) اجی قبلہ! قطع کلام کی معافی چاہتا ہوں لیکن اگر دو ایک اصلاحیں میں بھی سن لوں تو شاید نواب صاحب کے علم و فضل سے تھوڑا بہت فیض مجھے بھی حاصل ہو سکے۔

(لوگوں کا ہنسنا)

حالی: مولانا! آپ ظلمت کے رخ سے پردہ اٹھوا کر اسے کیوں عام کرنا چاہتے ہیں آخر؟ جانے دیجیے۔

غالب: نہیں میاں! تمہارا کیا حرج ہے دو ایک شعر سنانے دو نا دوسرے تو خیر کسب فیض کریں ہی گے، خود مجھے بھی اس فخر کا موقع ہاتھ آئے گا کہ جس استاد کے لیے میں ساری زندگی ترسا، اس کی زیارت برزخ میں آکر ہوئی۔

طباطبائی: (تیزی سے) حضرت! آپ کی باتوں میں طنز کے جو نشتر چھپے ہوئے ہیں وہ سیدھے دل میں اترتے ہیں لیکن جو کچھ میں نے زندگی میں کہا اس کے کہنے میں اب کیوں تامل کروں میں خود مولوی صاحب کی فرمائش پوری کیے دیتا ہوں مولوی صاحب قبلہ خصوصاً توجہ فرمائیں۔

عبدالعلی: جی ارشاد!

کئی آوازیں: مولوی صاحب ہی نہیں ہم سب ہمہ تن گوش ہیں۔

طباطبائی: مرزا صاحب قبلہ کی ایک بیت ہے:

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

حضرات! انصاف فرمائیے کہ یہاں مصرعہ اولیٰ اور مصرعہ ثانی میں کیا باہمی ربط و تعلق ہے — سوال یہ ہے کہ جب ہاتھ قلم ہو گئے تو جنوں

کی حکایات خوں چکاں آخر قبلہ و کعبہ کیسے لکھتے رہے، اس ناچیز نے دونوں مصرعوں میں باہمی ربط پیدا کرنے کے لیے مصرعہ ثانی پر ستره مصرعے لگائے ہیں اور ہر مصرع — اگر آپ اسے خود ستائی تصور نہ فرمائیں — مرزا کے مصرعے کے مقابلے میں زیادہ برمحل ہے۔

حسرت: سبحان اللہ!

فضل حق: (طنز سے) جی بیقرار ہے جلدی سنائیے حضور وہ مصرعے۔

طباطبائی: چند مصرعے پیش خدمت ہیں:

چھوڑا نہ درِ کو یار کے کیا کیا ستم ہوئے

آسی: ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے — سبحان اللہ حضرت سبحان اللہ۔

طباطبائی: تسلیمات! اب دوسرا مصرعہ عرض ہے:

پردہ اٹھا کے ہم نے تمہیں دیکھ تو لیا

بیخود: ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے — داد نہیں دی جا سکتی حضور اس ہمت کی۔

عبدالعلی: سچ ہے حضور! آب حیواں درون تاریکیست — اور وہ کیا مصرعہ ہے آتش علیہ الرحمۃ کا جی ہاں وہ،

سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لینا ہے

طباطبائی: قدر شناسی ہے جناب کی۔

فضل حق: (چپکے سے) اجی! سخن شناسی عالم بالا ہے — اور ارشاد ہو حضور!

طباطبائی: ملاحظہ کیجیے:

چوری سے بوسہ خط رخسار لے لیا

حسرت: کیا نزاکت ہے تخیّل کی (ایک ایک ٹکڑے پر زور دیکر دوبارہ پڑھتے

ہیں اجیری سے ـــــ بوسۂ خطِ رخسار ۔۔ لے لیا ۔

فضل حق : جناب بے خود اس خطِ رخسار کی داد دیجیے ۔

بیخود : اور اس میں لکھنوی رنگ تغزّل کی جو جھلک ہے اس کی طرف آپ نے توجہ نہیں فرمائی ۔

فضل حق : سبحان اللہ وہ تو خیر لکھنؤ والوں کا حصّہ ہے ـــــ اس کی داد بغیر دیئے بھی ان تک پہنچ جاتی ہے ـــــ جی ہاں نواب صاحب، اور کوئی اصلاح ۔

طباطبائی : جی ہاں ! ابھی تو بہت سے مصرعے ہیں سنیے !

کئی آوازیں : سنائیے، سنائیے !

طباطبائی : کھانے دیا نہ ہم نے کسی نخل کو ثمر

کئی آوازیں : ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

غالب : (ہنس کر) ارے صاحبو ! یہ کیا غضب ہے تم سب تو بیچارے نواب صاحب کے پیچھے پڑ گئے ـــــ حالانکہ اگر سوچو تو اس زمانہ میں ایسے جامع کمالات لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں، شارح بھی، مفسر بھی، شاعر بھی، اہل زبان بھی، اب یہ بات اور ہے کہ ان کی شاعری معنی آفرینی نہیں قافیہ پیمائی ہے رہی ان کی زباں دانی اور فرہنگ طرازی تو آپ سب جانتے ہیں کہ یہ سب فرہنگ طرازی مانند پیاز ہیں جس قدر اتارتے جاؤ گے چھلکوں کا ڈھیر لگتا جائے گا مغز نہ پاؤ گے لباس ہی لباس دیکھو گے، شخص معدوم ۔

طباطبائی : قبلہ و کعبہ یہ سب کچھ درست ہے ـــــ شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں اور فرہنگ طرازی پیاز کے چھلکے ہیں، لیکن آپ کی شاعری ؟ وہ بھی ایک چیستاں ہے ایک زمانہ ہے کہ اس چیستاں کو حل کرنے میں لگا ہوا ہے، شعر ایک اور شارح بیس سب ٹکریں مارتے

ہیں اور صبح شام سر کھپاتے ہیں مگر نتیجے میں صفر لفظ ہی لفظ ہیں معنی معدوم۔

حالی: نواب صاحب! غالب جیسے شاعر نکتہ داں کے لیے آپ کا یہ ارشاد بڑا عجیب و غریب سا ہے۔

طباطبائی: حضرت آپ کے لیے عجیب و غریب ہوگا شاید دوسرے مدح سراؤں کے لیے بھی ہو، لیکن بات سچ ہے اور آپ نہیں مانتے تو دیکھ لیجیے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا — مثلاً یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

کس کو سناؤں حسرت اظہار کا گلہ
دل فرد جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

میں نے اس چیتاں کو یوں حل کیا ہے۔

"حسرت اظہار گویا زبان کے نہ ہونے سے گلہ مند ہے کس کے آگے اس گلہ کو بیان کروں اور فرد جمع و خرچ سے طومار شکایت مراد ہے۔ یعنی اظہار شوق زبان سے نہ ہوگا تو دل میں زبان کی شکایتیں بھری رہیں گی شاعر نے زبان کو اس اعتبار سے کہا ہے کہ بہت سے موقعوں پر زبان نے اظہار شوق میں کوتاہی کی ہے اور ممکن ہے کہ احباب کی زبانیں مراد ہوں"

اب حسرت صاحب یہاں تشریف فرما ہیں ان سے بھی مطلب پوچھ لیجیے۔

حسرت: صاحب میرے نزدیک تو مطلب یہ ہے کہ ہزاروں حسرتیں ایسی تھیں جن کے اظہار کی حسرت دل ہی دل میں رہ گئی پس ہمارا دل زبان ہائے لال کی فرد جمع و خرچ ہے یعنی شکوہ کا ایک دفتر ہے۔

طباطبائی: اب سنیے بیخود صاحب کا مطلب!

بیخود: صاحب میرے نزدیک تو شاعر یہ کہتا ہے کہ میں اپنے بیان کی حسرت کا شکوہ کس کے سامنے کروں میرا دل گونگی زبانوں کی جمع و خرچ کی فرد

ہے یعنی ان احباب کے شکوہ کا دفتر بنا ہوا ہے جو نہ ہنستے ہیں اور نہ جواب دیتے ہیں

طباطبائی: اور جناب آسی کا کیا ارشاد ہے۔

آسی: حضرت امیر ے خیال سے تو مطلب صاف ہے۔

فضل حق: چلیے قصہ پاک ہوا!

حسرت: سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں۔

حالی: جی نہیں: واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں۔

طباطبائی: حضرت اس سنجیدہ بات کو یوں شگفتہ طبعی میں نہ ٹالیے اور فرمائیے کہ جو کچھ میں نے عرض کیا وہ ٹھیک تھا کہ نہیں؟

غالب: ہاں صاحب! لفظ لفظ ٹھیک بلکہ حرف بہ حرف درست —— لیکن آپ نے مطالب کے اس فرق کو میری ژولیدگیٔ بیان پر محمول فرمایا ہے اور میں اس کی تاویل یوں کرتا ہوں کہ شرح کلام میں پیروی قیاس کبھی کبھی سامع کے لیے گمراہی کا باعث بن سکتی ہے

سنجود: سبحان اللہ حضور!

حسرت: بس اسی کا نام نکتہ دانی و نکتہ سنجی ہے۔

حالی: اور یہ چیزیں غالب پر ختم ہیں۔

غالب: غالب نکتہ سنج ہے، نکتہ داں ہے، نغز گفتار ہے اور غالب مشکل پسند ہے مہمل گو ہے اس نے شاعری کو چیستاں بنایا ہے۔ غالب یہ بھی ہے اور وہ بھی ہے لیکن فقیر غالب خاموش ہے نہ اسے ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پرواہ —— وہ تو صرف یہ جانتا ہے کہ وہ شاعر ہے اس نے شاعری کو خود اختیار نہیں کیا بلکہ شاعری نے اسے مجبور کیا کہ وہ اسے اپنا فن قرار دے۔

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

اس لیے جب تک شاعری کا نام زندہ ہے غالب چشم حسود کی نشتر زنی کے باوجود زندہ رہے گا اور.........

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

یا اللہ اب یہ کون فرشتۂ رحمت داخل ہوا......

(اہل مجلس میں سرگوشی کی ملی جلی آوازیں ــــ اس دوران میں غالب کا رک رک کر کہنا)

جب تک جیا زمانے کی ناقدری کا شکوہ رہا ــــ اب مر کر سوچا تھا کہ چین نصیب ہوگا۔ لیکن یہ شارح، میرے کلام کے......

(اس دوران میں باہر سے کچھ لوگوں کے آنے کا کھٹکا اور کسی کا ان سے کہنا کہ حضرات یونہی خاموش کھڑے رہیے)

قدردان، مجھے زندگی جاوید دینے والے عیسیٰ نفس ان کی سخن فہمی اور معنی آفرینی تو سارے ناقدروں کی ناقدری پر بھاری ہے ــــ کوئی کہتا ہے غالب کے شعر بے معنی ہیں، غالب کہتا ہے گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی یہ تم کون ہو میرے کلام پر اصلاح دینے والے ــــ تم! کہ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ میری طرز گفتار کیا ہے، میرے شعروں کو اپنے قیاس سے پیدا کیے ہوئے معنی پہناتے ہو۔ جب کہ تمہیں شعر پڑھنے کا بھی سلیقہ نہیں تم میرے شعروں کو چیستاں کہتے ہو اور پھر اس چیستاں کا مطلب بیان کرتے ہو تو تمہاری عبارت خود اس سے بڑی چیستاں بن جاتی ہے (زہرخند) تم نے ایجاز کو جو کلام و معنی کا جوہر ہے شرح طرازی

میں صرف کیا ہے اور تم نے جو جوہر معنی کے جوہری ہو (ہنس کر) جب بات کو سمجھا نہیں تو کہدیا کہ مطلب صاف ہے ـــــ پیاز کے چھلکے راہ سخن کے حوالی اور تمہیں یہ زعم ہے کہ تم نہ ہوتے تو غالب گمنامی کی موت مرتا اور......

ایک آواز: (جوش کے ساتھ) غالب کو گمنامی کی موت مارنے والے خود فنا ہو جائیں گے غالب کو کوئی نہیں مار سکتا وہ ہمیشہ زندہ رہے گا وہ ہمیشہ بزم سخن پر حکمرانی کرے گا کہ اس کا دیوان الہامی کتاب ہے۔

دوسری آواز: یہ کون صاحب ہیں۔

تیسری آواز: ہو نہ ہو یہ عبدالرحمٰن بجنوری ہیں۔

پہلی آواز: اور ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ایک وید مقدس اور دوسرا دیوان غالب!

دوسری آواز: بے شک یہ عبدالرحمٰن بجنوری ہیں۔

پہلی آواز: ٹینس، شیلی، ورڈزورتھ سب کا کلام اس کے آگے گرد ہے۔

غالب: لیکن اے طرحدار نوجوان تم آخر ہو کون۔

بجنوری: اے سریر آرائے جہان سخنوری اے تاجدار بزم معنی آفرینی تیرے اس حلقہ بگوش کا نام عبدالرحمٰن ہے اور دنیا اسے ڈاکٹر بجنوری کے نام سے جانتی ہے۔

غالب: لیکن تمہارا کام۔

بجنوری: میرا کام! بس ایک کام ہے دنیا میں مجھے ـــــ نادانوں کو یہ بتانا کہ غالب کے تخیل کی رفعت بے نظیر ہے اور اس کی دقیقہ سنجی دنیا کے شعر میں بے عدیل۔

غالب: اور یہ تمہارے ساتھ کون صاحب ہیں؟

حالی: حضرت! آپ انہیں نہیں پہچانتے ــــ مولانا محمد حسین آزاد۔
غالب: وہی میاں آزاد جنہیں کبھی کبھی استاد ذوق کی مجلسوں میں دیکھا ہے۔
حالی: جی ہاں وہی!
غالب: ہائے رے ضعف بصارت۔ تو کیا انھوں نے بھی فقیر غالب کے کلام کی شرح لکھی ہے۔
حالی: جی نہیں! مولانا نے اُردو شاعری کا ایک تذکرہ تحریر فرمایا ہے۔ اور آب حیات اس کا نام رکھا ہے ــــ آب حیات تذکرہ نگاروں کا صحیفہ ہے مولانا نے نثر میں شاعری کی ہے لیکن ایسی شاعری کہ بڑی سے بڑی تنقید بھی اس کے آگے پھیکی اور بے معنی ہے۔
غالب: ذرا میاں ہم بھی سنیں اس کا کوئی ٹکڑا۔
آزاد: آزاد دیوانہ نے پانچویں دور سے پہلے جو تمہید لکھی ہے اس میں شعرائے متاخرین کی سب خصوصیتوں کی طرف اشارہ ہے۔ جو ٹکڑا "اس باکمال" کو ذہن میں رکھ کر لکھا گیا ہے وہ سن لیجیے۔

"تم دیکھو گے بعض بلند پرواز ایسے اوج پر جائیں گے کہ یہاں آفتاب تارا ہو جائے گا۔ وہ اپنے آئین کا نام خیال بندی اور نازک خیالی رکھیں گے مگر حق یہ ہے کہ شاعری ان کی ساحری اور وہ خود اپنے وقت کے سامری ہوں گے ......"

کئی آوازیں: سبحان اللہ!
غالب: جزاک اللہ اور صاحب تم نے کچھ شعروں کی شرح بھی ضرور کی ہوگی۔
آزاد: قبلہ و کعبہ! فقیر آزاد نے شعروں کی شرح نہیں لکھی اس نے شعروں کی خیالی تصویریں بنائی ہیں ــــ آدمی عالم خیال میں ان تصویروں کا نقش

باندھے اور شعر پڑھے تو شعر کئی گنا زیادہ مزہ دیتا ہے اس کو شرح سمجھیے یا تفسیر۔

غالب: بھلا صاحب! ہمیں بھی دو ایک تصویریں دکھاؤ۔

آزاد: جو حکم! دو ایک تصویریں ملاحظہ کیجیے۔

"ایک دفعہ مرزا بہت قرضدار ہو گئے۔ قرض خواہوں نے نالش کر دی، جواب دہی میں طلب ہوئے مفتی صاحب کی عدالت تھی جس وقت پیشی میں گئے، یہ شعر پڑھا:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن"

کئی آوازیں: سبحان اللہ!

آزاد: دوسری تصویر ملاحظہ فرمایئے:

"مرزا صاحب کو ایک آفت ناگہانی کے سبب سے چند روز جیلخانہ میں اس طرح رہنا پڑا جیسے حضرت یوسف کو زندان مصر میں (مجمع داد دیتا ہے) کپڑے میلے ہو گئے جوئیں پڑ گئیں تھیں ایک دن بیٹھے ان میں سے جوئیں چن رہے تھے ایک رئیس وہیں عیادت کو پہنچے پوچھا حال کیا ہے؟ آپ نے یہ شعر پڑھا:

ہم غم زدہ جس دن سے گرفتار بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جس دن وہاں سے نکلنے لگے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو وہاں کا کرتا وہیں پھاڑ کر پھینکا اور یہ شعر پڑھا:

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا"

(مجمع نے تحسین کی صدائیں بلند کیں لیکن غالب بآواز پکارے)

غالب: اے لوگو! جلد میں دیوانہ ہو جاؤں گا ــــ عبدالعلی، حسرت، طباطبائی، نظامی، آسی اور آزاد سب تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایک سے ہیں۔ سب نے مل کر عالم برزخ کو میرے لیے دوزخ کا نمونہ بنایا ہے ....

(لوگ آہستہ آہستہ چلو، چلو یہاں سے، جلدی چلو کہتے ہوئے رخصت ہونے لگتے ہیں)

...... میری صحبتیں اور میری شامیں جیسی پہلے تھیں ویسی ہی اب بھی ہیں:

نہ شام ما را سحر نویدی نہ صبح ما را دم سپیدی
چو حاصل ماست نا امیدی غبار دنیا بفرق عقبیٰ

فراق گورکھپوری

غالب پھر اس دنیا میں

جب میں اس دنیا میں تھا تو میں نے بے چین ہو کر ایک بار کہا تھا:

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آج موت کی نیند بھر اچٹ گئی۔ کیا نیند، کیا موت، دونوں میں کسی کا اعتبار نہیں، جب زندہ تھے تو زندگی کا رونا تھا اور موت کی تمنا تھی، میں نے کہا تھا:

قیدِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شمع اور سحر کا کیا ذکر ہے میں نے تو کھلی کھلی بات کہہ دی تھی ہاں ایک اور شعر یاد آگیا:

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

لیکن ذوق نے اس سے بھی لگتی ہوئی بات کہی تھی۔ وہ نہ جانے یہ شعر کیسے کہہ گئے تھے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ہاں تو میں کہاں ہوں، ابھی میرے حواس درست نہیں، لیکن یہ زمین اور یہ

آسمان تو کچھ جانے بوجھے معلوم ہوتے ہیں لوگوں کو ایک طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہا ہوں میں بھی انہیں کے ساتھ ہو لوں ۔۔۔ "پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں" ۔۔۔ اب ان راستوں پر پالکیاں جاتی ہوئی نظر نہیں آئیں گھوڑا گاڑیاں چل رہی ہیں۔ لیکن ان کی شکل و صورت بالکل بدلی ہوئی ہے آنکھوں کے سامنے سے بیسیوں ایسی گاڑیاں بھی گزر گئیں جن میں کوئی جانور جتا ہوا نہیں تھا سن رہا ہوں کہ لوگ انہیں موٹر کار کہتے ہیں۔ ان کل پرزوں سے چلنے والی گاڑیوں میں تیزی اور بھڑک تو بہت ہے لیکن پرانی سواریوں کی سی بات ان میں کہاں۔ خیر یہ تو ہونا تھا آج سے نہ جانے کتنے برس پہلے جب میں اس دنیا میں تھا تب ہی زمانہ کروٹ بدل چکا تھا یہ کایا پلٹ آنکھوں کے لیے نئی چیز ہو اور دل و دماغ کو بھی حیرت میں ڈال دے لیکن میری آنکھوں نے تو اس وقت پچھلی زندگی پائی تھی وہ انقلابات دیکھے تھے کہ اب کیا کہوں حیرت کیا کروں اور کس بات پر کروں۔ بچپن اور جوانی میں قلعہ کے رنگ ڈھنگ کو دیکھا تھا۔ مغل دربار کی جھلملاتی ہوئی شمع "داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی" پھر بھی ایک نیا رنگ پیدا کر رہی تھی۔ شہر کے شریفوں اور رئیسوں کی زندگیاں دیکھی تھیں۔ دور دور تک کا سفر گھوڑوں پر، بہلیوں پر، پالکیوں پر اور ڈاک گاڑیوں پر طے کیا تھا۔ پھر ۱۸۵۷ کا غدر ہوا، غدر کیا ہوا قیامت آگئی۔ اس کے بعد پچھلی ہی زندگی میں ریل کی سواری پر دلی سے کلکتہ کا لمبا سفر پورا کیا معلوم نہیں معلوم نہیں کلکتہ کی شان اب کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہوگی۔ اس وقت یہ شہر دلہن بنا ہوا تھا جس کی یاد سے اب بھی تڑپ اٹھتا ہوں:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں   اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

اور یوں تو نہ کچھ رونق میں رکھا ہے نہ اجڑی حالت میں رکھا ہے۔ نہ آبادی میں نہ ویرانے میں پھر بھی جو کچھ ہے اور جیسا کچھ ہے غنیمت ہے۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

انسان جب زندگی کی مصیبتوں سے پریشان ہو جاتا ہے تو اسے دنیا چھوڑنے کی سوجھتی ہے اپنے کو دھوکا دینے اور غلط راستہ پر چلنے کو اکثر لوگ خدا کی تلاش یا سچائی کا پا جانا سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سچائی کی بھی سچائی مجھے معلوم ہے:

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
جب پا نہ سکے اس کو تو آپ اپنے کو کھو آئے

دنیا کو چھوڑ کر تو پیغمبر بھی کچھ نہیں ہوتا۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

میں اپنے خیالات کی دھن میں کہاں نکل آیا یہ تمام چیزیں یہ مکانات اور یہ آبادی نئی بھی معلوم ہوتی ہے اور پرانی بھی اجنبی بھی اور مانوس بھی وہ سامنے دھندلکے میں لال قلعہ نظر آرہا ہے کچھ دور پر جامع مسجد کے برج اور مینار نظر آرہے ہیں میں دلی ہی میں ہوں ہائے دلی! وائے دلی!!

اس بازار کی شان تو دیکھنے کی چیز ہے چاندنی چوک! اچھا یہ وہی پرانا چاندنی چوک ہے جو بار بار لٹا اور بار بار آباد ہوا۔ اجڑا اور بسا۔ اس کا نام تک نہیں بدلا یہاں تو نئی زندگی کے شور و پکار میں بھی یہاں کی نئی آوازوں میں بھی پرانے نام کان میں پڑ رہے ہیں کوچہ چیلاں کوچہ بلیماران ان دو محلّوں میں برسوں میرا قیام رہا ہے بہار آتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ لیکن باغ وہی رہتا ہے۔

اس بازار میں اس دوسری دنیا سے پلٹ کر گیا ہوں خریدیں جب زندہ تھے تبھی یہ حال تھا کہ :

درم و دام اپنے پاس کہاں　　چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

لیکن اس طرف کچھ کتابیں بیچنے والوں کی دکانیں ہیں کتابوں کی دنیا مردوں اور زندوں دونوں کے بیچ کی دنیا ہے یہاں ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ "ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں" چلیں ذرا کتابوں کی اس خیالی دنیا کی سیر کریں۔ وہ ایک طرف الماری میں کوئی نہایت اچھی اور قیمتی کتاب رکھی ہوئی ہے جلد تو دیکھو کیسی خوبصورت ہے سنہرے حرفوں سے کچھ لکھا ہوا بھی ہے اس کے برابر چھوٹی چھوٹی کتابیں دیکھنے میں کیسی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ "ارے بھئی ذرا یہ سامنے لگی ہوئی کتابیں تو اٹھا دینا وہی جو سامنے کے تختے پر الماری میں لگی ہوئی ہیں چھپائی اور لکھائی کے یہ کھیل پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے دیوان غالب، دیوان غالب، دیوان غالب مرقع چغتائی! امیری آنکھیں یہ کیا دیکھ رہی ہیں۔ برلن اور ہندوستان کے کئی شہروں سے یہ کتابیں نکلی ہیں، کیوں بھئی ذوق اور مومن، ناسخ اور آتش، میر اور سودا یہ سب کے سب غالب سے زیادہ مشہور تھے ان کے کلام تو اور ٹھاٹ سے چھپے ہوں گے ذرا انہیں بھی دیکھوں۔ کیا کہا ؟ صرف غالب کے دیوان اس اہتمام سے نکلے ہیں۔ پھر کیا کہا ؟ آج غالب کی کہی ہوئی باتوں کا سارے ہندوستان میں شور ہے، غالب پر کتابیں اور غالب پر مضامین کثرت سے نکل رہے ہیں۔ اچھا! یہ کہنا بھی کسی ڈاکٹر بجنوری کا ملک میں مشہور رہے کہ ہندوستان کی دو بڑی کتابیں ہیں ایک وید مقدس اور دوسری دیوان غالب تو صرف رہنا سہنا ہی اس ملک کا نہیں بدلا بلکہ مذاق شاعری کی بھی کایا پلٹ گئی ہے ہاں اب آپ دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہوں۔ شکریہ۔ اب میں اپنے اس شعر کو کیا کہوں :

ہوں خفائی کے مقابل میں ظہوری غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

پہلی زندگی میں دوسروں کی شہرت کے کھیل دیکھے تھے مرنے کے بعد اپنی شہرت کے کھیل دیکھ رہا ہوں وہ زندگی کی چھیڑ تھی یہ موت کی ہے ۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے — کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا
ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب — مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

اس مرقع چغتائی کو کیا کہوں اگر میرے اشعار تصویر کے نیچے نہ لکھے ہوتے تو میں بھی ان تصویروں کو نہ سمجھتا۔ خیر تو ان لکیروں اور رنگوں سے میرے شعروں کا مطلب سمجھایا گیا ہے نہ دیوان غالب ہوتا نہ تصویر بنانے والا اپنا یہ کمال دکھا سکتا :

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

بہر حال غزل کے مطلب کو تصویر کے پردوں سے ظاہر کرنے کی ادا کو میں کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا۔ زیادہ تر تصویریں بے لباس ہیں :

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

خیر اتنا تو ہوا کہ "چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط" ایک جگہ کر دیئے گئے حسینوں کے خط یعنی ان کی شوخ طبیعت ان کے چنچل مزاج کی وہ تصویریں جو میرے اکثر اشعار میں اکثر دکھائی دیتی ہیں اور یوں تو حسینوں کے خطوط بھی معلوم :

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

خیر مشہور ہوئے تو کیا اور نہ ہوئے تو کیا میرا وہ فارسی کلام جس کا ہندوستان میں جواب نہیں تھا وہ اس دوکان میں نظر نہیں آتا میرے چند اشعار سے اگلے وقتوں کے لوگوں کو اور ممکن ہے آج کل کے لوگوں کو بھی یہ دھوکا ہو کہ میں نے اپنی شہرت کی ساری وجہ اپنے فارسی کلام کو جانا تھا اور اردو کی بڑائی کو میں نہیں سمجھا تھا یہ ایک مزید دھوکا ہے اردو آگے بڑھ کر کیا کچھ ہونے والی تھی اس کی جھلک میں دیکھ چکا تھا میرے اردو کلام کے چند شعر جن میں فارسی زیادہ تھی لوگ لے اُڑے تھے اور یہ نہ دیکھ سکے تھے کہ میں نے غزل کو کتنی چنچل کتنی ٹکسالی کتنی چٹیلی کتنی جیتی جاگتی بولتی چالتی چیز بنا دیا تھا۔ اگر میں اردو کی اہمیت کو نہ سمجھتا تو اپنے ان خطوط کو جن میں میں نے چٹھی کو بات چیت بنا دیا تھا اس احتیاط اور اس اہتمام سے بچا کر نہ رکھتا، قریب قریب سب سے چھوٹا اُردو دیوان میں نے چھوڑا تھا اور مجھے یقین تھا کہ سب سے زیادہ میرے ہی اشعار لوگوں کی زبان پر ہوں گے اب یہاں مجھے بہت دیر ہو چکی کتاب بیچنے والا بھی اپنے دل میں کیا کہتا ہوگا یہ ایک اخبار رکھا ہوا ہے کیوں بھئی اس پر آج ہی کی تاریخ ہے نا؟ اچھا تو آج ۲۳ جون ۳۸ء ہے مجھے کچھ یاد آتا ہے کہ میں ۱۸۶۹ تک زندہ تھا اس کے بعد دوسری دنیا کی زندگی تھی اور اس میں ماہ و سال کہاں، آج اس دنیا سے گئے ہوئے ستر برس ہونے کو آئے اتنے بڑے اور طویل عرصہ میں محض اپنی شہرت اور کامیابی کا حال جان کر خیر، ایک طرح خوش تو ہوں لیکن یہ جاننے کے لیے بےچین ہوں کہ ہندوستان میں اب کیسی شاعری ہو رہی ہے کوئی کتب خانہ تو پاس ہوگا لوگ کسی ہارڈنگ لائبریری کا پتہ دے رہے ہیں۔ اچھا دیکھوں یہاں کیا داغ امیر حالی اکبر اقبال حسرت موہانی جگر اصغر شاد عظیم آبادی عزیز جوش اور دوسرے شعرا کے مجموعے نظر آ رہے ہیں ان میں داغ اور امیر کو تو میں پچھلی زندگی ہی میں

جانتا تھا۔ حالی تو میرے سب سے ہونہار شاگردوں میں تھے اکبر سے بیسیوں برس پہلے اس دوسری دنیا میں ملا تھا جہاں سے خود آیا ہوں اور جہاں تمام مرے ہوئے شعراء کے ساتھ یہ سب بزم سخن کی رونق بن گئے ہیں وہاں اکبر کا ساتھ چھوڑنے کو تو جی نہیں چاہتا تھا اور اقبال تو ابھی ابھی وہاں پہنچے ہیں اس شخص کی شہرت وہاں برسوں پہلے پہنچ چکی تھی اور فرشتوں کی زبان پر اقبال کے نغمے برسوں پہلے سے تھے میں نے اردو میں جس طرح کی شاعری کی داغ بیل ڈالی تھی، شاعری کو جو عظمت دینا چاہی تھی میری یہ کوشش اقبال ہی کے ہاتھوں پروان چڑھی حسرت موہانی کا کلام دیکھا مومن جرأت مصحفی کا نام اس کلام سے چمک گیا۔ جگر، اصغر، شاد، عزیز، چکبست اور سرور جہاں آبادی ان سب کی شاعری اپنی اپنی جگہ اونچی ہے لیکن کہیں کہیں روک تھام اور گہری نظر کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ دیکھوں یہ یاس یگانہ کون شخص ہے اور اس کی آیات وجدانی میں کیا ہے شعر تو جاندار ہیں بیان کا طریقہ بھی کہیں کہیں استادانہ ہے آتش کی گرما گرمی اور تیزی بھی مل جاتی ہے لیکن غالب کا نام اس شخص پر بھوت کی طرح سوار ہے۔ خیر۔" وہ کہیں اور سنا کرے کوئی" ـــ مرزا قتیل کی یاد تازہ ہوگئی غالب نہ جانے کتنے شاعروں کی دکھتی ہوئی رگ ہے میں اردو میں مسلسل نظم کی ترقی دیکھ کر خوش ہوں۔

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

غزل ہو یا نظم سنجیدگی مذاق کی پاکیزگی اور گری ہوئی باتوں سے بچنا بھی وہ خوبیاں ہیں جو شاعری کو پیغمبری کا درجہ دے دیتی ہیں ہاں کچھ عجیب اور غلط باتیں بھی میرے بعد کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ ایک صاحب غالب کی جانشینی کا دعویٰ یوں کرتے ہیں کہ جس طرح میر کے ستاسی برس کے بعد غالب کا زمانہ آیا اسی

طرح غالب کے ستاسی برس بعد وہ پیدا ہوئے حالانکہ ہر وقت اور میرے زمانے کے ستاسی برس کے بعد بھی بیوقوف دنیا میں پیدا ہو سکتے ہیں اپنے کچھ اچھے کچھ برے اشعار کو لوگ الہام بھی بتانے لگے ہیں اپنی غلط اور بے ڈھنگی نقالی بھی دیکھتا ہوں بہت ہو رہی ہے مہمل فارسی ترکیبیں ایک رسمی قسم کی مشکل پسندی لفظ پرستی اور شعریت سے معرا بلند آہنگی اور اظہار علمیت یہاں تک کہ غیر موزوں کلام کو بھی شاعری بنانا یہ سب باتیں بھی آج کل کے شعرا میں آ گئی ہیں میں اردو نثر اور اردو رسالوں اور اخباروں کی کثرت اور آب و تاب کو دیکھ کر بھی خوش ہوں رقعات غالب گویا اس بات کی پیشین گوئی تھے ـــــ یہ سب صحیح لیکن دلی کی پچھلی صحبتیں یاد آ گئیں اور دل کو تڑپا گئیں اب نہ ذوق ہیں نہ مومن نہ شیفتہ نہ داغ نہ حالی نہ مجروح نہ انور خیر شعر و شاعری ہی تو ساری زندگی نہیں ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ ملک پھر جاگ رہا ہے اس کی تمام قومیں مل کر ایک نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش میں ہیں اپنا شعر مجھے یاد آیا:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

میری نظر یہ بھی دیکھ کر خوش ہیں کہ انگریزوں کی تہذیب ان کے علم و فن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھی ہندوستان اپنی تہذیب کو پھر سے زندہ کرنا چاہتا ہے:

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

اب شام ہو رہی ہے میں صرف ایک پل کے لیے اس دنیا میں آیا تھا شاید مجھے آئے ابھی کچھ وقت نہیں ہوا اور پل مارتے ہیں سنتے سب کچھ دیکھ لیا دوسری دنیا کا ایک پل اس دنیا کی ایک صدی کے برابر ہوتا ہے ہم اہل عدم

ایک پل میں جو کچھ دیکھ لیتے ہیں دنیا میں اس کے لیے ایک عمر چاہیے اب نہ وہ دلی ہے نہ ستر برس پہلے کا زمانہ، نہ مرزا ہرگوپال تفتہ ہیں کہ اس بے سروسامانی میں میری پیاس بجھائیں اب تو قرض کی بھی نہیں پی سکتے اخباروں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب شراب اس ملک میں بند ہونے والی ہے:

مے بہ زہاد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب
پیش ایں قوم بہ شوربۂ زمزم نہ رسد

ہندوستان بہت بدل چکا ہے لیکن اگلے وقتوں کے لوگ معلوم ہوتا ہے ابھی باقی ہیں:

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

خیر شراب سے نشاط اور خوشی کس کافر کو درکار ہے،

"یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے"

اور وہ بے خودی مجھ پر چھا چکی ہے دنیا کے حسن کے کرشمے دیکھ چکا میں اس تماشہ کو قیامت کہتا ہوں میں خاک ہو چکا تھا،

بجز پرواز ناز شوق کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیداں پر

پھر آنکھ کھل گئی،

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

کنہیّالال کپور

غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں

[دورِ جدید کے شعرا کی ایک مجلس میں مرزا غالب کا انتظار کیا جا رہا ہے اس مجلس میں تقریباً تمام جلیل القدر شعرا تشریف فرما ہیں۔ مثلاً ن م ارشد، ہیرا جی، ڈاکٹر قربان حسین خالص میاں رفیق احمد خوگر، راجہ مہر علی خاں، پروفیسر غیظ احمد غیظ، بکرما جیت ورما، عبدالحی نگاہ وغیرہ وغیرہ یکایک مرزا غالب داخل ہوتے ہیں۔ ان کی شکل وصورت بعینہٖ وہی ہے جو مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں بیان کی ہے، ان کے ہاتھ میں دیوان غالب کا ایک نسخہ ہے تمام شعرا کھڑے ہو کر آداب بجا لاتے ہیں]

غالب: حضرات میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے جنت میں دعوت نامہ بھیجا اور اس مجلس میں مدعو کیا میری مدت سے آرزو تھی کہ دورِ جدید کے شعرا سے شرف نیاز حاصل کروں۔

ایک شاعر: یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے ورگرنہ ~

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب: رہنے بھی دیجیے، اس بے جا تعریف کو من آنم کہ من دانم

دوسرا شاعر: تشریف رکھیے گا۔ کہیے جنت میں خوب گزرتی ہے آپ تو فرمایا کرتے تھے ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن۔

غالب: بھئی جنت بھی خوب جگہ ہے جب سے وہاں گیا ہوں ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکا۔

دوسرا شاعر: تعجب جنت میں آپ کو کافی فراغت ہے اور پھر ہر ایک چیز میسر ہے پینے کو شراب انتقام لینے کو پری زاد ــــ اور اس پر یہ فکر کوسوں دور کہ:

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا　　آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

باوجود اس کے آپ کچھ لکھ.........

تیسرا شاعر: (بات کاٹ کر) سنائیے اقبال کا کیا حال ہے،

غالب: وہی جو اس دنیا میں تھا دن رات خدا سے لڑنا جھگڑنا وہی پرانی بحث ؎

مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

پہلا شاعر: میرے خیال میں وقت کافی ہو گیا ہے اب مجلس کی کارروائی شروع کرنی چاہیے۔

دوسرا شاعر: میں کرسی صدارت کے لیے جناب م ن ارشد کا نام تجویز کرتا ہوں

تیسرا شاعر: اور میں تائید کرتا ہوں،

(ارشد صاحب کرسئ صدارت پر بیٹھنے سے پہلے حاضرین مجلس کا

شکریہ ادا کرتے ہیں)

م ن ارشد: میرے خیال میں ابتدا مرزا کے کلام سے ہونی چاہیے...... میں نہایت ادب سے مرزا موصوف سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا کلام پڑھیں۔

غالب: بھئی جب ہمارے سامنے شمع لائی جائیگی تو ہم بھی کچھ پڑھ کر سنا دیں گے

م ن ارشد: معاف کیجیے گا۔ مرزا۔ اس مجلس میں شمع وغیرہ کسی کے سامنے نہیں لائی جائے گی۔ شمع کے بجائے یہاں پچاس کینڈل پاور کا لیمپ ہے اس کی روشنی میں ہر ایک شاعر اپنا کلام پڑھے گا۔

غالب: بہت اچھا صاحب تو غزل سنیے گا۔

باقی شعرا: ارشاد۔

غالب: عرض کیا ہے،

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

(باقی شعرا ہنستے ہیں مرزا حیران ہو کر ان کی جانب دیکھتے ہیں)

غالب: اجی صاحب یہ کیا حرکت ہے نہ داد نہ تحسین اس بے موقع خندہ زنی کا مطلب؟

ایک شاعر: معاف کیجیے گا مرزا ہمیں یہ شعر کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔

غالب: بے معنی؟

میراجی: دیکھیے نا مرزا، آپ فرماتے ہیں خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو اگر مطلب کچھ نہیں تو خط لکھنے کا فائدہ ہی کیا اور اگر آپ صرف معشوق کے نام ہی کے عاشق ہیں تو تین پیسے کا خط برباد کرنا ہی کیا ضرور سادہ کاغذ پر اس کا نام لکھ لیجیے۔

ڈاکٹر قربان حسین خالص: میرے خیال میں اگر یہ شعر اس طرح لکھا جائے تو زیادہ موزوں ہے۔

خط لکھیں گے کیونکہ چھٹی ہے ہمیں دفتر سے آج
اور چاہے بھیجنا ہم کو پڑے بیرنگ ہی
پھر بھی تم کو خط لکھیں گے ہم ضرور
چاہے مطلب کچھ نہ ہو
جس طرح سے میری اک اک نظم کا
کچھ بھی تو مطلب نہیں
خط لکھیں گے کیونکہ الفت ہے ہمیں
میرا مطلب ہے محبت ہے ہمیں
یعنی عاشق ہیں تمہارے نام کے

غالب: یہ تو اس طرح معلوم ہوتا ہے جیسا آپ میرے اس شعر کی ترجمانی کر رہے ہیں

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

میرا جی: جنوں! جنوں کے متعلق مرزا میں نے کچھ عرض کیا ہے اگر اجازت ہو تو کہوں۔

غالب: ہاں ہاں بڑے شوق سے

میرا جی: جنوں ہوا جنوں ہوا
مگر کہاں جنوں ہوا
کہاں ہوا وہ کب ہوا
ابھی ہوا یا اب ہوا

نہیں ہوں میں یہ جانتا
مگر جدید شاعری
میں کہنے کا جو شوق ہے
تو بس یہی ہے وجہ کہ
دماغ میرا چل گیا
یہی سبب ہے جو مجھے
جنوں ہوا جنوں ہوا

غالب: (ہنسی کو روکتے ہوئے) سبحان اللہ کیا برجستہ اشعار ہیں۔

م ن ارشد: اب مرزا غزل کا دوسرا شعر فرمایئے۔

غالب: میں اب مقطع ہی عرض کروں گا کہا ہے:

عشق نے غالب نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عبدالحی نگاہ: گستاخی معاف مرزا۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرع اس طرح لکھا جاتا تو ایک بات پیدا ہو جاتی۔

غالب: کس طرح؟

عبدالحیٔ نگاہ: عشق نے ہاں ہاں تمہارے عشق نے
عشق نے سمجھے؟ تمہارے عشق نے
مجھ کو نکمّا کر دیا
اب نہ اٹھ سکتا ہوں میں
اور چل تو سکتا ہی نہیں
جانے کیا بکتا ہوں میں

یعنی نکما کر دیا
اتنا تمہارے عشق نے
گرتا ہوں اور اٹھتا ہوں میں
اٹھتا ہوں اور گرتا ہوں میں
یعنی تمہارے عشق نے
اتنا نکما کر دیا

غالب: (طنزاً) بہت خوب بھئی غضب کر دیا۔
غیظ احمد: اور دوسرا مصرع اس طرح لکھا جا سکتا ہے:

جب تک نہ مجھ کو عشق تھا
تب تک مجھے کچھ ہوش تھا
سب کام کر سکتا تھا میں
اور دل میں میرے جوش تھا
اس وقت تھا میں آدمی
اور آدمی تھا کام کا
لیکن تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا

غالب: واللہ کمال ہی تو کر دیا۔ بھئی اب آپ لوگ اپنا کلام سنائیں
م ن ارشد: اب ڈاکٹر قربان حسین خالص جو جدید شاعری کے امام ہیں اپنا کلام سنائیں گے۔
ڈاکٹر خالص: اجی ارشد صاحب میں کیا کہوں اگر میں امام ہوں تو آپ مجتہد ہیں آپ جدید شاعری کی منزل ہیں اور میں سنگ میل اس لیے آپ

اپنا کلام پہلے پڑھیے۔

م ن ارشد: توبہ توبہ اتنی کسر نفسی اچھا اگر آپ مصر ہیں تو میں ہی اپنی نظم پہلے پڑھتا ہوں، نظم کا عنوان ہے "بدلہ" عرض کیا ہے۔

آمری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
جس کے آغوش میں یوں ناچ رہے ہیں شعلے
جس طرح دور کسی دشت کی پہنائی میں
رقص کرتا ہو کوئی بھوت کہ جس کی آنکھیں
کرم شب تاب کی مانند چمک اٹھتی ہیں
ایسی تشبیہ کی لذت سے مگر دور ہے تو
تو کہ اک اجنبی انجان سی عورت ہے جسے
رقص کرنے کے سوا اور نہیں کچھ آتا
اپنے بے کار خدا کے مانند

دوپہر کو جو کبھی بیٹھے ہوئے دفتر میں
خودکشی کا مجھے یک لخت خیال آتا ہے
میں پکار اٹھتا ہوں یہ جینا بھی ہے کیا جینا
اور چپ چاپ دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں

آمری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
تاکہ میں چوم ہی لوں عارض گلفام ترا
اور ارباب وطن کو یہ اشارہ کردوں

اس طرح لیتا ہے اغیار سے بدلہ شاعر
اور شبِ عیش گزر جانے پر
بہرِ جمع درم و دام نکل جاتا ہے
ایک بوڑھے سے تھکے ماندے سے رہوار کے پاس
چھوڑ کر بسترِ سنجاب و سمور

(نظم سن کر سامعین پر وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہے ہیراجی یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ یہ نظم اس صدی کی بہترین نظم ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو اس میں انگیٹھی بھوت اور دفتر تہذیب و تمدن کی مخصوص الجھنوں کے حامل ہیں)

(حاضرین ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہیں۔)

غالب: ارشد صاحب معاف کیجیے گا آپ کی یہ نظم کم از کم میرے فہم سے تو بالاتر ہے۔

غیظ احمد غیظ: یہ صرف ارشد پر ہی کیا منحصر ہے، مشرق کی جدید شاعری ایک بڑی حد تک مبہم اور ادراک سے بالاتر ہے۔

م ن ارشد: مثلاً میرے ایک دوست کے اس شعر کو لیجیے۔

پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

غالب: (شعر کو دہرا کر) صاحب سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ اس شعر میں سر اور پیر کے الفاظ شامل ہیں مگر باوجود ان کے اس شعر کا نہ سر ہے نہ پیر۔

م ن ارشد: اجی چھوڑیے اس حرف گیری کو آپ اس شعر کو سمجھے ہی نہیں مگر خیر

اس بحث میں کیا رکھا ہے کیوں نہ اب ڈاکٹر قربان حسین خالص سے درخواست کی جائے کہ اپنا کلام پڑھیں۔

ڈاکٹر خالص: میری نظم کا عنوان ہے "عشق" عرض کیا ہے،

عشق کیا ہے؟
میں نے اک عاشق سے پوچھا
اس نے یوں رو کر کہا
عشق ایک طوفان ہے
عشق اک سیلاب ہے
عشق ہے اک زلزلہ
شعلۂ جوّالہ ــــ عشق
عشق ہے پیغام موت

غالب: بھئی یہ کیا مذاق ہے، نظم پڑھیے مشاعرے میں نثر کا کیا کام؟

ڈاکٹر خالص: (جھنجلا کر) تو آپ کے خیال میں یہ نثر ہے، یہ ہے آپ کی سخن فہمی کا عالم اور فرمایا تھا آپ نے۔ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

غالب: میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ یہ کس قسم کی نظم ہے نہ ترنم نہ قافیہ نہ ردلیف

ڈاکٹر خالص: مرزا صاحب۔ یہی تو جدید شاعری کی خصوصیت ہے۔ آپ نے اردو شاعری کو قافیہ اور ردلیف کی فولادی زنجیروں میں قید کر رکھا ہے ہم نے اس کے خلاف جہاد کر کے اسے آزاد کیا اور اس طرح اس میں وہ اوصاف پیدا کیے ہیں جو محض خارجی خصوصیات سے کہیں زیادہ اہم ہیں میری مراد رفعت تخیل تازگی افکار اور ندرت فکر سے ہے۔

غالب: رفعت تخیل کیا خوب کیا پرواز ہے۔

میں نے ایک عاشق سے پوچھا اس نے یوں رو کر کہا

ڈاکٹر خالص: (چڑ کر) عاشق رو کر نہیں کہے گا تو کیا قہقہہ لگا کر کہے گا؟ مرزا آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ عشق اور رونے میں کتنا گہرا تعلق ہے۔

غالب: مگر آپ کو قافیہ اور ردیف ترک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

رفیق احمد خوگر: اس کی وجہ مغربی شعرا کا تتبع نہیں بلکہ ہماری طبیعت کا فطری میلان ہے جو زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب میں بھی آزادی کا جویا ہے، اس کے علاوہ دور جدید کی روح انقلاب کشمکش تحقیق تجسس تعقل پرستی اور جد وجہد ہے ماحول کی اس تبدیلی کا اثر ادب پر ہوا ہے اور میرے اس نکتے کو ٹھیکرے نے بھی اپنی کتاب وینٹی فیئر میں تسلیم کیا ہے چنانچہ اس لیے ہم نے محسوس کیا کہ قدیم شاعری ناقص ہونے کے علاوہ روح میں وہ لطیف کیفیت پیدا نہیں کر سکتی جو مثال کے طور پر ڈاکٹر خالص کی شاعری کا جوہر ہے۔ قدیم شعرا اور جدید شعرا کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے قدیم شعرا بقول مولانا آزاد حسن و عشق کی حدود سے باہر نہ نکل سکے۔ اور ہم جن میدانوں میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں نہ ان کی وسعت کی کوئی بھی انتہا ہے اور نہ ان کے عجائب و لطائف کا شمار۔

غالب: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

م ن ارشد: خوگر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم ایک نئی دنیا میں رہتے ہیں یہ ریڈیو ہوائی جہاز اور دھماکے سے پھٹنے والے بموں کی دنیا ہے یہ بھوک بیکاری انقلاب اور آزادی کی دنیا ہے اس دنیا میں رہ کر ہم اپنا وقت حسن و عشق گل و بلبل شیریں فرہاد کے افسانوں میں ضایع نہیں کر سکتے شاعری کے لیے اور بھی موضوع سخن ہیں جیسا کہ ہمارے ایک شاعر نے کہا

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی اجداد پہ کیا گزری ہے
یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
یہ ہر اک سمت پُر اسرار کڑی دیواریں
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے

راجہ مہر علی خاں : بہت خوب ۔ یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے ایسے ہی مضامین میں سے ایک مضمون "ڈاک خانہ" ہے جو میری اس نظم کا جو میں ابھی آپ کے سامنے پڑھوں گا موضوع ہے ۔

غالب : ڈاک خانہ ؟

راجہ مہر علی خاں : مرزا اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے سنئے عرض کیا ہے :

ڈاک خانہ کے ہے اندر آج اف کتنا ہجوم
ڈالنے کو خط کھڑے ہیں کس قدر اف آدمی
ان میں ہر اک کی تمنا ہے کہ وہ
ڈال کر جلدی سے خط یا پارسل
بھاگ کر دیکھے کہ اس کی سائیکل
ہے پڑی باہر جہاں رکھ کر اسے
ڈاک خانہ میں ابھی آیا تھا وہ خط ڈالنے
جا رہے ہیں خط چہار اطراف کو
بمبئی کو مصر کو لندن کو کوہ قاف کو

دیکھنا آئی ہے اک عورت لفافہ ڈالنے
کون کہتا ہے کہ اک عورت ہے یہ
یہ تو لڑکا ہے کسی کالج کا کہ
جس کے بال
خد و خال
اس قدر ملتے ہیں عورت سے کہ ہم
اس کو عورت کا سمجھتے ہیں بدل
اف ہماری لغزشیں
ہے مگر کس شخص کا یہ سب قصور
کیا نظر میری نہیں کرتی ہے کام
جھٹپٹا سا ہو گیا ہے شام کا
یا ہمارے ہے تمدن کا قصور
کہ ہمارے نوجواں
ڈاک خانے میں ہیں جب آتے لفافہ ڈالنے
اس قدر دیتے ہیں وہ دھوکا ہمیں
کہ نظر آتے ہیں ہم کو عورتیں

(زوروں کی داد دی جاتی ہے ہر طرف سے مرحبا بھئی کمال کر دیا کے نعرے بلند ہوتے ہیں مرزا غالب کی سراسیمگی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی ہے)

م ن ارشد: اب میں ہندوستان کے مشہور شاعر پروفیسر غبط سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے تازہ افکار سے ہمیں نوازیں۔

پروفیسر غبط: میں نے تو کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔

ہیرا جی : تو پھر وہی نظم سنا دیجئے، جو پچھلے دنوں ریڈیو والوں نے آپ سے لکھوائی تھی۔
پروفیسر : آپ کی مرضی ہے تو وہی سن لیجئے عنوان ہے،، لگائی،،

فون پھر آیا دل زار نہیں فون نہیں
سائیکل ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامن افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمۂ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

(نظم کے دوران میں اکثر مصرعے دو دو بلکہ چار چار بار پڑھوائے جاتے ہیں اور پروفیسر غیظ بار بار مرزا غالب کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں مرزا غالب مبہوت ہیں)

م ن ارشد : حضرات میرے خیال میں یہ کوئی عشقیہ نظم نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر نے اینٹی فاشسٹ جذبے کو خوب نبھایا ہے۔

رفیق احمد : (سرگوشی کے انداز میں ہیرا جی سے) بکواس ہے!

م ن ارشد : اب ہیرا جی اپنا کلام پڑھیں گے۔

ہیرا جی : میری نظم کا عنوان ہے " بینگن "

غالب : بینگن ؟

ہیرا جی : بینگن ۔ اگر آپ آم کی صنعت میں قصیدہ لکھ سکتے ہیں تو کیا بندہ بینگن

پر نظم لکھنے کا حقدار نہیں۔

غالب: معاف کیجیے گا نظم پڑھیے۔

میراجی: عرض کیا ہے۔

چنچل بینگن کی چھب نیاری
رنگ میں تم ہو کرشن مراری
جان گئی ہیں سکھیاں پیاری
رادھا رانی آہی گئی تو ــــــ
کرشن کنھیا و ــ ـڈھ رہے ہیں۔
لیکن میں تو بھول چکا ہوں
بینگن سے یہ بات چلی تھی
بھوک لگی ہے کتنی ہائے
جی میں ہے اک بھون کے بینگن
کھاؤں لیکن رادھا پیاری
رنگ کو اس کے دیکھ کے مجھ کو
یاد آتے ہیں کرشن مراری
اس لیے بھوکا رہنا بہتر ــــــ
چونکہ میں ہوں پریم پجاری

دسہر طرف سے داد دی جاتی ہے بعض شعرا یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں بھئی جدید شاعری میراجی ہی کا حصہ ہے

م ن ارشد: اب جناب بکرماجیت ورما سے استدعا کی جاتی ہے کہ اپنا کلام سنائیں۔

بکرماجیت ورما: میں نے حسبِ معمول کچھ گیت لکھے ہیں۔
غالب: (حیران ہو کر) شاعر اب گیت لکھ رہے ہیں مرے اللہ دنیا کدھر کو جارہی ہے۔
بکرماجیت ورما: مرزا آپ کے زمانے میں گیت شاعری کی ایک باقاعدہ صنف قرار نہیں دیئے گئے تھے دورِ جدید کے شعراء نے انہیں ایک قابلِ عزت صنف کا درجہ دے دیا ہے۔
غالب: جی ہاں ہمارے زمانے میں عورتیں، بھانڈ، مراسی یا اسی قماش کے اور لوگ گیت لکھا کرتے تھے۔
بکرماجیت ورما: پہلا گیت" برہن کا سندیس" عرض کیا ہے۔

اڑجا دیس بدیس رے کوّے اڑجا دیس بدیس
سن کر تیری کائیں کائیں۔

غالب: خوب سن کر تیری کائیں کائیں!
بکرماجیت: عرض کیا ہے:

سن کر تیری کائیں کائیں
آنکھوں میں آنسو بھر آئیں
بول یہ تیرے من کو بھائیں
مت جانا پردیس رے کوّے اڑجا دیس بدیس

م ن ارشد: بھئی کیا اچھوتا خیال ہے پنڈت صاحب میرے خیال میں ایک گیت آپ نے کبوتر پر بھی لکھا تھا وہ بھی مرزا کو سنا دیجیے۔
بکرماجیت ورما: سنیے پہلا بند ہے:

بول کبوتر بول
دیکھو کوئلیا کوک رہی ہے

من میں میرے ہوک اٹھتی ہے
کیا تجھکو بھی بھوک لگی ہے
بول غٹر غوں بول کبوتر
بول کبوتر بول

باقی شعرا: (ایک زبان ہوکر) بول کبوتر بول بول کبوتر بول

(اس اثنا میں مرزا غالب نہایت گھبراہٹ اور سراسیمگی کی حالت میں دروازے کی طرف دیکھتے ہیں)

بکرماجیت ورما: اب دوسرا بند سنیے:

بول کبوتر بول
کیا میرا ساجن کہتا ہے
کیوں مجھ سے روٹھا رہتا ہے
کیوں میرے طعنے سہتا ہے
بھید یہ سارے کھول کبوتر
بول کبوتر بول

باقی شعرا: (ایک زبان ہوکر) بول کبوتر بول کبوتر بول کبوتر بول

(اس شور و غل کی تاب نہ لاتے ہوئے میاں رفیق احمد خوگر اور عبدالحی نگاہ کے سنانے کی باری آنے سے پہلے ہی مرزا غالب بھاگ کر کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں)

جیم

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

غالب کے کلام میں بیگم غالب کا حصّہ
چھیڑ غالب سے چلی جائے
غالب اپنے کلام کے آئینے میں
غالب انڈ گو بیٹے
دیوان غالب صاحب

صالحہ عابد حسین

غالب کے کلام میں بیگم غالب کا حصّہ

غالب کا چند جزو کا دیوان ہمیشہ سے ہماری محبوب کتاب رہی ہے۔ اس کا ننھا سا خوبصورت جرمن ایڈیشن تو تعویذ کی طرح سفر اور حضر میں ساتھی بنا رہتا ہے۔ دل خوش، موڈ ٹھیک اور طبیعت موزوں ہو تو غالب کے دل کش، پرجوش اور طرب افزا اشعار اور پھڑکتی ہوئی غزلیں دماغ اور زبان پر رہتی ہیں، پریشانی ہو تو پر سوز و پر اثر شعر دل بہلاتے ہیں۔ رنج و غم ہو تو مایوسی و ناکامی سے بھرپور شعر اسے ہلکا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بیماری کی شدت میں ہمارا ذہن غالب کے حسین و پر اثر اشعار کی نامعقول پیروڈی کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جی ہاں یہ گستاخی عام طور پر بیماری کی شدید تکلیف ہی میں ہوتی ہے۔ مثلاً ہمارے گردے کا آپریشن ہوا تو یہ شعر الہام ہوا۔

شق ہو گیا ہے گردہ خوشا لذت فراغ
تکلیف پردہ داری درد کمر گئی

اور دمہ کے شدید دوروں میں تو غالب کے اشعار ذرا سی رد و بدل سے ہمارے بڑے آسانی سے بن جاتے ہیں:

یہ مرض دمے کا بھی جانے کیا قیامت ہے　　　آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

یا: کھانسی ہے صبر طلب سانس ہمارا بے تاب
دل کا کیا رنگ کریں خونِ جگر ہونے تک

اور: نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ سر ہوئے وہ یہاں آکے "دم" ہوئے

اس ذکر سے مطلب نصیب دشمناں یہ غلط فہمی نہیں کہ خدانخواستہ ہم میں شعر گوئی کے جراثیم موجود ہیں بلکہ اس محبت اور شغف کا اعتراف ہے جو ہم کو غالب کے اشعار سے ہے کہ درد کی تکلیف میں کمی بھی اسی بہانے ہوتی ہے۔

ایک رات کچھ ایسی حالت تھی۔ دمہ کی تکلیف سے کئی راتیں آنکھوں میں کٹ چکی تھیں تیماردار تھک کر سو گئے تھے۔ مگر ہماری آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی اور دماغ تھا کہ غالب کے اس شعر کا ورد کیے جارہا تھا ذرا سے تصرف کے بعد ؎

کاوے کاوے سخت جانی ہائے بیماری نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

ایک شعر کی تکرار سے تنگ آکر ہم نے سرہانے کی الماری سے ہاتھ بڑھا کر دیوان غالب اٹھایا۔ لیمپ کا بٹن سوئچ دبایا اور دمہ کی رات اور ہجر کی شب کا موازنہ شروع کر دیا کہ کون سی زیادہ سخت و زیادہ ناقابل برداشت ہوتی ہے:

کیوں اندھیری ہے شب "دم" ہے بلاؤں کا ہجوم
آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا؟

پڑھتے پڑھتے جب اس شعر پر پہنچے ؎

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

تو ہم ٹھٹک گئے! کیا یہ شعر غالب کا ہے یا ان کی بیوی کا! بھلا مرنے کے مدت

بعد غالب یہ شعر کہہ کر کیسے بھیج سکتے تھے، ابھی تک تو وائرلیس کا ادھر اور ادھر سے براہ راست تعلق قائم نہیں ہو سکا ہے اور پھر مدت بعد اس ملک سے غالب کو اور کون یاد کرتا سوائے ان کی بیوی کے۔

میں یہ سوچ رہی تھی کہ مجھے اپنے سرہانے سے کسی کی ہلکی سی ہنسی کی آواز آئی یہ کون ہنسا؟ میں نے تکیوں پہ ٹکے سر کو بمشکل اٹھایا تو کیا دیکھتی ہوں کہ سر سے پاؤں تک سفید پاکیزہ لباس میں ملبوس ایک نورانی صورت بی بی ہاتھ میں تسبیح لیے بیٹھی ایک خاص انداز میں ہنس رہی ہیں۔ جیسے ماں بچے کی نادانی پر پیار بھری طنزیہ ہنسی ہنستی ہے، میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا! وہ دلی کی پاکیزہ اور لوچ دار اور شیریں زبان میں خاص عورتوں کے لہجے میں بولیں "بچی تو تو غالب کی بڑی دلدادہ ہے نا؟ اور خیر سے اللہ رکھے اپنے نزدیک شعر و سخن کا ذوق بھی رکھتی ہے، کیوں جھوٹ کہتی ہوں؟ پھر بھی تجھے اس میں شبہ ہے کہ یہ شعر غالب کا "اللہ انھیں کروٹ کروٹ بہشت نصیب کرے" ہے یا ان کی بیوی کا؟"

مجھے حیرت تھی کہ یہ کون بی بی ہیں جو ایسی پیاری زبان بول رہی ہیں اور بغیر کہے میرے خیالات جان گئیں۔

"ہاں! ہاں! تیرا خیال درست ہے۔ یہ شعر غالب کی بیوی ہی کا ہے اور ایک اسی شعر پر کیا موقوف ہے، غور سے ان کا دیوان پڑھو بیوی پھر دیکھوگی کہ اس میں کتنے شعر ان کی بیوی کے موجود ہیں۔"

اب تو میں سنبھل کر بیٹھ گئی۔ واہ یہ بزرگ خاتون بھی خوب ہیں کس آسانی اور یقین سے وہ اتنا بڑا دعویٰ کر رہی ہیں آخر ان کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے میں نے ذرا جرأت کر کے پہلی بار زبان کھولی مگر "مثلاً" سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"اے بوا مثالیں کہاں تک دوں گی، دو چار دس بیس شعر ہوں تو کوئی

مثالوں سے سمجھائیے۔ وہاں تو کتنی غزلوں میں اس کے شعر موجود ہیں۔ کتنے قطعوں میں وہ نظر آتی ہے۔ ذرا دیکھنے والی آنکھ، سوچنے والا دماغ اور عقل سلیم ہو تو ہی اس کی پرکھ ہو سکتی ہے بچی۔ تو نے اس شعر کے بارے میں کیا سوچا اور یہ شعر بتا کس کا ہے ؎

گھر میں کیا تھا کہ تیرا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتی تھی میں اک حسرتِ تعمیر سو ہے

اب تو میں اور چونکی ہوئی! یعنی ان بی بی حضرت نے غالب کا اتنا اچھا شعر بھی ان کی بیوی کو بخش دیا۔ اس طرح تو یہ سارا دیوان ان کا دیوان ان کے نام منسوب کر دیں گی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے احتجاج کیا "مگر دیکھیے تو مصرعہ ہے ؎

"وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے"

وہ پھر ہنسیں، وہی بزرگانہ ہنسی "اے ہے محبت کرنا آج کل کی لڑکیوں کو خوب آتا ہے۔ اول تو مصرعہ یوں ہو تب بھی غالب کی بیوی کا ہو سکتا ہے۔ مگر وہ یوں نہیں یوں ہے جیسے میں نے تجھے سنایا تو تو جانتی ہوگی کہ پہلے زمانے میں یائے معروف اور یائے مجہول ایک ہی طرح چھوٹی ی کے انداز میں لکھی جاتی تھی، غالب کی بیوی بیچاری کے کتنے شعر تو کتابت کے اسی ایک اصول کے سر صدقے ہو گئے"۔

بھلا میں کیسے مان لیتی کہ میرے محبوب ترین شاعر غالب کے اشعار کسی اور کی ملکیت ہیں۔ ڈر تو لگتا تھا کہ ڈانٹ نہ پڑ جائے۔ مگر میں ایسی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والی نہ تھی "یہ بھلا آپ کیا فرما رہی ہیں —— غالب کی دقیانوسی، ان پڑھ بیوی بھلا شعر اور ایسے شعر کہتیں جن پر آج تک اہل ذوق کو غالب کے اشعار کا دھوکا ہوتا رہے، یہ میں نہیں مان سکتی"۔

ایک لمحے کے لیے بڑی بی کا چہرہ تمتما اٹھا مگر پھر شفقت بھری مسکراہٹ

چہرے پر کھیلنے لگی" احمق یہ تیرا نہیں تیرے زمانے کا قصور ہے۔ آج کل کی لڑکیاں اسکولوں میں چار حرف گٹ پٹ کے پڑھ کر اپنے کو عالم فاضل سمجھتی ہیں اور پر اسنے زمانے کی عورتوں کو جاہل محض۔ تو نے کیسے یہ سمجھا کہ غالب کی بیوی جاہل بے وقوف اور دقیانوسی تھی۔ وہ ایک عالم فاضل خاندان کی بیٹی تھی جو ذوق شعر و سخن میں سارے ہندوستان میں مشہور تھا۔ پھر اس کا غالب جیسے بے مثال شاعر کا پچاس سال سے زیادہ ساتھ رہا تھا یا نہیں؟ تو بوا ایسے گھرانے کی لڑکی، ایسے خاوند کی بیوی! اور اگر اللہ میاں نے بھی اسے شعر کہنے کا ذوق دیا ہو تو پھر؟ پھر بھی تو کہے گی کہ اس کا شعر کہنا اور اچھے شعر کہنا کیسے ممکن ہے؟

میری دلچسپی اب محویت کے حد تک پہونچ گئی تھی اور زبان کھولنے کی یوں بھی جرأت مشکل تھی۔

غالب کے دیوان میں تجھے کتنے ہی شعر ملیں گے جو ان کے نہیں ان کی بیوی کے ہیں۔ جانتی ہو بوا کہ ان دونوں کا بیاہ بہت نو عمری میں ہو گیا تھا۔ کچھ شعر نوجوانی کے اسی رنگین زمانے کی یادگار ہیں جب غالب کا بانکا اور مردانہ حسن اُس کے دل میں کھب کر رہ گیا تھا، مشرقی حیادار بیوی ہوتے ہوئے بھی آخر دل تو وہ بھی رکھتی تھی، نامراد! اسی زمانے کا ایک شعر ہے ؎

سبزہ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

ایک بار سج بن کر کہیں جانے لگے بیوی کو دھج دکھانے آئے کیسا لگ رہا ہوں فی البدیہہ کہا ؎

ترے جواہر طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

یہ تو بیوی تم جانتی ہو کہ شاعر عاشق ضرور ہوتا ہے چاہے سچا عاشق ہو یا جھوٹ موٹ بن جاتا ہو۔ اب بوا جانے میری بلا کہ وہ جو عشقیہ شعر کہتے تھے تو سچ مچ کسی پر عاشق تھے یا بیوی کو جلانے کے لیے بن گئے تھے۔

بیوی نے کسی ڈومنی ورمنی کو آنکھ سے کبھی نہیں دیکھا، مگر ان کے شعروں میں ان کے عشق کی داستان کو پڑھا اور سنا ضرور کرتی تھی ـــــ اور تم بھی بوا عورت ہو۔ عورت کے دل کا حال سمجھ سکتی ہو۔ شریف زادیاں منھ سے نہ کہیں چاہتی یوں ہی ہیں کہ ان کا میاں ان کی محبت کی داستان کے سوا کسی اور کا ذکر ہی نہ کرے۔ مگر غالب ٹھہرے شاعر وہ بھی غزل گو، رند مشرب، اب تم ہی کہو ان کی باتیں سن سن کر بیوی کا دل جلتا یا نہ جلتا؟ ان کی بیوی کے اُس زمانے کے شعروں میں شکوہ وشکایت بھی ہے اور اپنی چپکی چپکی شریف زادیوں والی محبت کا اظہار بھی۔ طعنے تشنے بھی ہیں اور نصیحت فضیحت بھی۔ مگر بوا غور کرو گی تو ہر جگہ ایسی اپنائیت پاؤ گی جو صرف بیوی کا ہی حصہ ہو سکتی ہے۔ تم ہی کہو یہ شعر کس کا ہو سکتا ہے ؎

ہو گئی ہے غیر کی شیریں زبانی کارگر
عشق کا ان کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

یہ بے زبان محبت مرد شاعر یا اس کی بازاری معشوقہ نگوڑی کیا کھا کے کرے گی!

بیوی جب میاں سے شکایت کرتی تو وہ یا تو کوئی بہانہ بنا دیتے یا کہتے ہم تو یہ باتیں محض تمہارے آزمانے کو کہتے ہیں تو اس کے سوا وہ اور کیا کہتی ؎

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

لیکن یہ سب منھ سے کہنے کی باتیں تھیں، بیوی کے دل کی سچی آواز تو یہی تھی ؎

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں　　نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

لیکن رشک و رقابت تو پیچھا بھی نہیں چھوڑتے۔ جب کبھی بھولے بسرے غالب اس کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ شعروں ہی میں دل کی لگی کا اظہار کیا کرتی جانتی تھی ناکہ حساس شاعر کے دل پر کیا چیز زیادہ اثر کرتی ہے۔ اس قسم کے دو چار شعر بھی سن لے: ایک دن آبدیدہ بیٹھی تھی۔ غالب نے پوچھا کیا بات ہے؟ تنک کر بولی ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اس لفظ "کوئی" سے مجھے نشان نہیں ملتا کہ یہ شعر کس کا ہے؟ اور اگر وہ کبھی دلداری کرتے تو جھٹ دل پگھل جاتا ؎

تم جانو تم کو غیر سے گر رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

غالب نیک دل با محبت اور شریف آدمی تھے۔ ان باتوں پر خواہ مخواہ شرمندہ ہو جاتے تو شوخی سے کہتی ؎

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے

ایک بار کئی دن غالب کی صورت نظر نہ آئی! جب آئے اور معذرت کی تو بولی جی ہاں جانتی ہوں ؎

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

اور پھر ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ؎

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ! اس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

ایک بار بہت دن کے بعد غالب نے پاؤں دبوانے کی خواہش ظاہر کی۔ ایسے موقعے بھی کبھی نصیبوں سے ہی ملتے ہیں خوشی کے مارے اس سے دباتے نہ بن رہا تھا۔ انھوں نے پوچھا "کیا بات ہے؟ کیسے دبا رہی ہو؟" مسکرا کر جواب دیا:

اسد خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں بھول گئے
کہا جو تو نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا آپس کی یگانگت اور بے تکلفی بڑھتی گئی یوں سمجھو کہ اب عشقیہ رنگ نے دوسرا رنگ پکڑ لیا۔ غالب کے شاعرانہ مزاج کا لاابالی پن بڑھا تو بیوی کی نصیحت فضیحت بڑھی مگر

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع تھی کہ واں ہو جائے گا

اور ؎
زندگی اپنی جو اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالب کی بادہ خواری تو سمجھ سکتی ہے بچی کہ ان کی باخدا بیوی پر کیسی بار گزرتی ہوگی۔ غالب کی وہ مشہور غزل تجھے یاد ہوگی ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ایک دن بڑے انہماک سے بیٹھے اسے لکھ رہے تھے۔ بیوی بھی تسبیح پھیرتی ادھر سے گذریں اور معرفت بھرے یہ شعر سن کر بہت متاثر ہوئیں۔ غالب نے پوچھا کہو کیسے ہیں؟ بے اختیار بولیں ؎

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ایک بار غالب نے کعبہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا صاف صاف نہ کہہ سکی

کہ یہ حرکتیں اور یہ تمنا۔ بس اتنا کہہ کر رہ گئی ؎

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب شرم تم کو مگر نہیں آتی

غالب کو گردش زمانہ سے پریشان اور ابنائے زمانہ کے رویہ سے رنجیدہ دیکھتی تو دلدہی اور دلداری بھی کرتی تھی۔ ایک بار سمجھاتے سمجھاتے آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی ؎

بے خانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا تو میری جان خدا ہے

ایک شعر اس وقت کا ہے جب غالب نئے نئے جہاں پناہ کے دربار سے وابستہ ہوئے تھے۔ ان کو چھیڑنے کے لیے کہہ اٹھیں ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

یہ ایسی ہی محبت بھری نوک جھونک تھی، جیسے غالب اپنے انداز میں اپنے خطوں میں کیا کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے بھی تو بیوی کو بیڑی سے تشبیہہ دی تھی نا! مگر تو بھی جانتی ہے اور وہ بھی جانتی تھی کہ یہ محض ان کی شوخی بیان اور ظریفانہ طرز ادا ہے۔

تجھے بعض شعر غالب کے یہاں زنانہ لب و لہجہ میں کہے ہوئے نظر آئیں گے اگرچہ جو کلام میں نے تجھے ان کی بیوی کا ابھی تک سنایا، اس میں زنانی بولی کم ہے غالب کی صحبت کا اثر تھا نا اس پر کبھی کبھی اپنا مخصوص رنگ جھلک اٹھتا ہے۔

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

غالب کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے۔

حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

اس کے پہلے مصرعہ میں تجھے کس کی بولی نظر آتی ہے۔ یہ بیوی کا مصرعہ ہی تو تھا جس پر گرہ لگا کر انھوں نے مطلع کہہ دیا اور پھر اپنی وہ مشہور غزل مکمل کی ایک اور شعر خالص زنانی بولی میں اس وقت کا ہے جب نیا نیا بیاہ ہوا تھا ؎

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ خلوت سہی جلوت نہ سہی

میں سب کچھ بھول کر ان بڑی بی کی باتیں سن رہی تھی دل کہہ رہا تھا کہ ذرا دیر یہ اور بیٹھ گئیں تو غالب بیچارے کو جن کے دیوان کا حجم یوں ہی بہت کم ہے بالکل ہی دست نہ کردیں اور وہ کہے جا رہی تھیں لیکن جب پچاس برس کا ساتھی بچھڑ گیا تو باوفا بیوی کا دل ٹوٹ گیا۔ شعر و سخن سے بھی جی بھر گیا اور سوائے اللہ اللہ کرنے کے کچھ بھی یاد نہ رہا غالب کے بعد اس نے بہت کم شعر کہے کبھی کبھی کراہ کے ساتھ کوئی شعر بے ساختہ منہ سے نکل جاتا تھا۔ ان ہی میں سے ایک مجھے یاد آیا۔

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

یا وہ شعر جو میں نے تجھے سنایا تھا اپنا ویران گھر دیکھ کر دل سے نکلا تھا ؎

گھر میں کیا تھا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتی تھی میں ایک حسرت تعمیر سو ہے

اور یہ شعر تو اکثر زبان پر رہتا تھا۔ جسے تم ابھی پڑھ رہی تھیں ؎

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے :: وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

—— "اللہ! اللہ!!"

اب غور سے انکی صورت دیکھتی ہوں تو یا اللہ —— میں سکتہ میں رہ گئی یہ خواب ہے یا بیداری —— میں سوتی ہوں یا جاگتی ہوں —— گورا چٹا رنگ تیکھے نقش و نگار لوہارو خاندان کا مخصوص انداز اور آب کوثر میں دُھلی ہوئی زبان۔

—— میرے منہ سے نکلا —— آپ —— آپ —— امراؤ بیگم —— امراؤ بیگم۔

—— "بیگم غالب"

—— میں نے آنکھیں کھولیں۔

کھانسی کے ایک جھٹکے نے مجھے کہیں سے کہیں لا پھینکا، کوئی میرا بازو ہلا کر کہہ رہا تھا —— "کیا ہوا —— کیا ہوا —— کسے پکار رہی ہو۔ کون امراؤ بیگم! —— میرا سانس شدت سے پھول رہا تھا۔ سینے پر دیوان غالب کھلا پڑا تھا۔

فضل احمد صدیقی

چھیڑ غالب سے چلی جائے

نام اسد اللہ خاں ولد مرزا عبد اللہ بیگ خاں، تخلص اسد ثم غالب، ساکن دلّی کے تھے، آگرہ میں ننھیال، لوہارو میں دادھیال، رنگ چمپئی قد انگشت نما داڑھی رکھتے اور مسّی لگاتے تھے پھر قضا را دونوں کو چھوڑ بیٹھے اور کہتے ہیں کہ جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا اتفاق دیکھیے کہ اسی دن ہنگامۂ غدر کے اولے پڑے اور نمک حراموں نے حویلیوں کی نیو ڈالی۔

مرزا غدر سے برسوں پہلے پیدا ہوئے تھے اور غدر کے برسوں بعد مرے ایام غدر میں ایک سن ستاون مچا تھا۔ مرزا جیتے تھے لیکن ہارے ہوئے پہلوان کی طرح دل بدست و پا افتادہ ہو بہو برخوردار بستر بنے پڑے تھے۔ اسی حالت میں چپکے چپکے آم اور حقہ چوستے اور بیسنی روٹی نوش فرماتے تھے۔ غلّہ کی راشن بندی ہونے کے باعث شاید جوار باجرہ بھی برسوں زہر مار کیا۔ آخر میں غلّہ کے بجائے کپڑے ہی کھانے لگے تھے۔ پھر بھی پور نہ پڑی تو چیخیں مار کر ؎

ہم نے یہ مانا رہیں دلّی میں پر، کھائیں گے؟

الاپتے ہوئے بیانوں کو نکل گئے جانے کے بعد خود ان کے در و دیوار پہ سبزی

تو کاریاں اُگ آئی تھیں لیکن مرزا نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

مرزا کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا لیکن گورے سپاہیوں سے دہشت کھا کر رہ گئے۔ خیر سے عام لام بندی کے ساتھ عام لوٹ کھسوٹ کا بھی بازار گرم تھا اس لیے بھی، اور کچھ اس لیے بھی بازار گرم تھا کہ یہ خود اپنی جوانی کو ننگ پیری جانتے تھے۔ رنگروٹی چھوڑ شاعری پر اتر آئے تھے جسے کبھی انھوں نے ذریعہ عزت نہ سمجھا۔ مرزا نے تقدیر سے مزاج بھی پایا تھا تو بلغمی جسے گرمی ہی راس تھی اس لیے پانی کم اور شراب زیادہ پیتے تھے۔ اور نقد کم ادھار زیادہ کھاتے تھے یعنی آج ادھار کل نقد کے قائل ہو گئے تھے۔ مستغنی المزاج اتنے تھے کہ تا دمِ مرگ قرض خواہوں کو الجھائے رکھا چنانچہ کبھی نہ آمدنی رکی نہ قرض رو کا نہ سود کی تکرار ٹھہری نہ ہاتھ رکا۔ ہاتھ سے زیادہ زبان کے جوہر دکھائے گئے ہیں۔

مرزا کی زبان کے جوہروں کا یہ ہے کہ وہ کبھی دشنہ و خنجر کہے بغیر نہ رہتے تھے۔ اور اکثر ایسا ہوا کہ جس سے انھوں نے بات کی اس نے شکایت ضرور دی، تاہم انکار مقصود سرحد ادراک سے پرے ہوتا تھا اس لیے سننے سمجھنے والے زیادہ تر سرحدی پٹھان ہی تھے۔ باقی اِس سرحد کے اِس پار شنیدن کے جال بچھائے کھڑے رہ جاتے تھے۔ بس زیادہ سخن فہم اصحاب ان کا کلام ادق بمنزلہ مہمل کے بتاتے ہیں مرزا نے اپنے شعروں کا انتخاب خود ہی کرنا چاہا تو اور زیادہ رسوائی بڑھی ناچار خجل ہو کر کہہ ہی اٹھے کہ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است بے رنگ ان کے اردو مجموعے کا ابتدائی نام سا معلوم ہوتا ہے ابہام تحقیق طلب ہے اس کے باوجود مرزا کسی دوسرے کی تاب نہ لاتے تھے کہ صلہ و ستائش کی تمنا ہی کب تھی ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کسی عیش پسند حکیم نے کسی ہدہد کی چونچ میں کچھ عمل حکمت کر کے رکھ دیا تا کہ مرزا اسے دو دو چونچیں ہو جائیں مرزا بہت پھڑپھڑائے لیکن

بات کچھ ایسی ہی تھی دم بخود بیٹھے رہے ان کا قابل اعتراض اور لقول شخصے مردود کلام شاید ڈیفنس آف انڈیا لینگویج ایکٹ کی زد میں آتا ہے۔ اس لیے برائے آگاہی خاص و عام بھوجتال کی سرکار عالیہ مدظلہا کی جانب سے مشتہر کرادیا گیا ہے دیسی ریاستوں میں اور یہ غالب نہیں! حد درجہ بنک خال ہے۔

مرزا غالب مجذوب صفت انسان تھے بچپن ہی سے پتھر پھینکنے لگے تھے لیکن سر کو بھی ہمر دریا در کھتے تھے ع۔ دیوانہ بکار خویش ہشیار حضرت میر تقی علیہ الرحمتہ سے جو بڑے جلالی قسم کے درویش ابن درویش تھے بیعت چاہیت فرمائی تو ان سے اعتقاد میں اس درجہ غلو فرمایا کہ ڈنکے کی چوٹ کہتے پھرے کہ آپ وہ بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں لیکن ستم ظریفی روزگار کو کیا کہیے کہ مرزا باوجود میر سے خفیدت رکھنے کے خود بہرے پتھر ہو گئے تھے تا آنکہ کوئی بات مکرر کہے بغیر سن ہی نہیں پاتے تھے، یہی نہیں میرزا غالب اپنے مرشد میر تقی میر کی روح پر فتوح کی خوشنودی کی خاطر مرزا اسد مرحوم کی روح سے آویزش کرنے کئی بار عالم ارواح تک پہنچ دہاں دوسرا ہی ماجرا گزرا مرزا کی نگاہ کسی حور جنت پر پڑی اور یہ وہیں بدنگاہی میں دھر لیے گئے۔ فرشتوں نے پہلے ہی تمام واقعہ ٹانک رکھا تھا مرزا ایک دفعہ تو جکر کھا گئے لیکن جلد ہی سنبھلے اور پھر جو جرح کی کہ اماں کوئی ہمارا آدمی بھی دم تحریر موجود تھا یا فرشتوں ہی کے لکھے پر ناحق پکڑ لیا جاتا ہے تو عاملان قضا و قدر لا جواب سے ہو کر رہ گئے۔ مرزا بادۂ دوشینہ کے بھبکے اڑاتے نزک دم دبا پھر دلی آئے اس واقعے کے بعد سے مرزا اپنے آپ کو میری اور مخالفین کو سودائی کہتے تھے جلے پھپھولے بھی پھوڑتے تھے کسی طرح آخری تاجدار مغلیہ نے تو استاد ذوق کے جلد وصال ہو جانے کے باعث یا بربنائے دفع الوقتی یا بطور رد بلا غالب کو اپنا استاد بنا لینے سے صاف انکار کر ہی دیا تھا لیکن مرزا تو ع

"تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی" پر عامل ٹھہرے جھٹ مسمیاں مرزا ہرگوپال تفتہ، مہیش داس، شیو جی رام سالک، اور میر مہدی جیسے پہلوانان سخن کے مسلم الثبوت استادی کا سہرا ان ہی کے سر رہا مرزا غالب کے اکھاڑے میں ہندو اور مسلمان سب زور کرتے اور ہندو مسلم سوال کو ہمیشہ دبائے رکھتے تھے۔ ایک دن میر مہدی لڑنت کرنے جو آئے تو اس انداز سے کہ ہاتھ پاؤں اور ناخنوں پر فریدآباد کی مہدی اور داڑھی پر وسمہ لگا ہوا چنانچہ بری طرح چوٹ کھا گئے۔ مرزا غالب نے ان کا تخلص مجروح رکھ دیا میر صاحب سید تھے پانی پت محلہ انصاریاں میں لنگڑاتے ہوئے جا پہنچے۔ لیکن تخلص کے ساتھ مرزا کا جو کچھ اثاث البیت تھا وہ بھی باندھ کر لے گئے مرزا کو اس خالص سرقہ شاعرانہ پر بڑا رنج ہوا اور انھوں نے خطوں کے ذریعے بہتیرا اویلا اس لوٹ پر مچایا لیکن دلی کی پولیس پنجاب کی پولیس سے ملی ہوئی تھی خاک نتیجہ نہ نکلا۔

غالب بڑے بامذاق آدمی تھے چنانچہ چلتے آدمی سے مذاق کرتے تھے ایک دن طبیعت جو گد گدائی تو کسی سراپا ناز سے واقعی پیش دستی ہی کر بیٹھے اور دھول دھپے تک نوبت پہنچی۔ خیر معاملہ رفع دفع ہوا تو خاندان والوں نے بصلاح صوابدید مرزا کی شادی کر دی سارا شہر براتیوں میں شامل تھا اور برات کا شاخ آہو پر بسیرا۔ سسرال والیاں انہیں مرزا نوشہ کہنے لگیں مرزا سسرال کے تھے بھی عاشق زار پھر سارے شہر میں مرزا نوشہ ہی مشہور ہو گئے ان کی شادی کا نقشہ خواجہ الطاف حسین نے جو اس وقت مثل شہ بالے کے تھے لیکن تھے بڑے بالغ نگاہ بشکل مرثیہ یوں کھینچا ہے۔ ع

خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

یہاں خواجہ سے مراد مرزا غالب ہیں ورنہ خواجہ تو خود مولانا الطاف حسین

حالی ہی تھے) مرزا نے اپنے سارے ہی ارمان نکالے لیکن نیت نہ بھری یہی کہتے رہے کہ ہر چند میرے ارمان بہت نکلے پھر بھی کم نکلے مرزا حقیقتاً بڑے رنگین مزاج واقع ہوئے تھے۔ اور نگاہ حسن شناس سے متصف اسی لیے ان کا ذوق جمالیاتی انھیں آٹھوں پہر بے چین رکھتا تھا اگر کوئی اچھی صورت دیکھے ہوئے ذرا بھی دیر ہو جاتی تو دیوانہ وار گنگناتے پھرا کرتے تھے کہ ہائے ع

کوئی صورت نظر نہیں آتی

لوگ ان کی انہی باتوں پر دم دیتے تھے۔ اور حق یہ ہے کہ اگر وہ بادہ خوار نہ ہوتے تو دلی والے انہیں ولی سمجھتے یہی وجہ ہے کہ جونہی مرزا کا انتقال ہوا ان کے مرتے ہی دلی بھی مر گئی۔ چاروں طرف لوگ سرمد کی طرح تڑپ تڑپ کر جان دینے لگے۔ نگہ ناز سرمہ سے خفا ہو گئی تو ادھر اصفہان میں سرمہ بنانے والوں نے بھی کمیونسٹوں کے اشارے پر ہڑتال کر دی سیکڑوں ناخن محتاج حنا رہ گئے شعلۂ عشق ماتم میں سیہ پوش ہو گیا۔ اور بجز چند اہل جفا کے سبھی بے چین و بے آرام ہو گئے جی کہ خود مرنے والے کے پاؤں گھبرا کر کفن سے باہر نکل آئے۔ غرض بڑا اختلال برپا ہوا جب اس طرح دلی پرانی اور قدیم دلی مر کر نیست و نابود ہو گئی تو صاحبان والا شان نے اپنے دم عیسوی سے یعنی ابن مریم بن کر روح غالب کے دکھوں کا مداوا کیا، یعنی پرانی دلی کو اجڑتا دیکھ غالب کو وہیں دفنا یا گیا اور بائیس قدم ہٹ کر ایک اور دلی بسادی آج کی نئی دلی اسی کل کی پرانی دلی کا نقش کہن ہی تو ہے جو بطرز نو مرصع نظر آتا ہے۔

اوروں کے سو تکلف اور غالب کی ایک سیدھی بات۔ برابر ہوتی تھی یہی وجہ تھی کہ ان کے تعلقات ہر کہ ومہ سے برابری کے تھے انہیں ایران توران تک سے نسبت تھی بقول مولانا حالی، عرفی ان پر فخر کرتے تو طالب رشک کھاتے

یعنی کلیتے تھے ایران کے ارسطو فطرت عالی جناب حکیم سنائی کا مطلب مرزا غالب ہی کی بدولت زیادہ چمک گیا تھا۔ صدہا روپے کی دوائیں دل اور جگر کی منگاتے اور مسہل تبریدوں کا سلسلہ رہا علیحدہ، ظاہر ہے کہ غالب کے مرتے ہی حکیم سنائی کی بھی رہی سہی بات بگڑ گئی۔ حضرت خاقانی پر بھی اس کا اثر پڑا حالی اس واقعہ فاجعہ سے متاثر ہو کر فرماتے ہیں:

بات بگڑی رہی سہی افسوس　　آج خاقانی و سنائی کی

شاید حالی، خاقانی و سنائی وغیرہم کی بات بدستور بنی رکھنا چاہتے تھے ورنہ اس کے بگڑنے پر افسوس ظاہر کرنے کے معنی؟

مرزا غالب بحیثیت مجموعی ایک بہت بڑے آدمی ہو گزرے ہیں ان کی بڑائی کا عالم یہ تھا کہ انھوں نے دنیا کو کبھی بازیچۂ اطفال سے زیادہ نہ سمجھا۔ کفر و ایمان سے چولی دامن کا ساتھ تھا کعبہ ان کے پیچھے پیچھے اور کلیسا آگے آگے چلتا تھا۔ ان کے نزدیک اعجاز مسیحا ایک بات اور اورنگ سلیمان ایک کھیل تھا، اسی کھلنڈرے پن کے باعث ان کی طبیعت میں بلا کا لڑکپن تھا۔ چوسر کو اس زمانہ میں آج کل کی گھوڑ دوڑ جیسی مقبولیت کہاں نصیب ہوتی۔ اس لیے یہ کھیل ذرا خلاف قانون سا تھا، مگر مرزا نے تو اپنے جی میں کچھ ٹھانی ہی اور تھی۔ وہ بھلا محتسب اور قانون کو کب خاطر میں لاتے۔ کھیلے اور خوب کھیلے۔ ہر چند بدلوگوں نے خفیہ والوں کو پتہ دیا اور برابر اشارے ہوا کیے لیکن یہ تھے ایسی محفل میں کہ حیا کے باعث بیٹھے ہی رہے چنانچہ دھر لیے گئے مقدمہ ہوا بازار فوجداری گرم ہوا گواہ اور شاہد دونوں جانب سے چھوٹتے خوب پالیاں رہیں لیکن سنتے ہیں کہ حکام متعلقہ اپنا حق پابی طلب کرتے تھے مرزا الٹا ان سے لے کر بھی نہ چھوڑتے بر سر عدالت صاف کہہ دیا کہ جناب والا:

درم و دام اپنے پاس کہاں   چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

اب مرزا کی شامت اعمال حاکم عدالت بگلا، بڑا غصہ ور اور خالص بنا سپتی کھانیوالا ماس (گوشت) اور چیلوں کا نام سن کر کباب ہو گیا اور مقدمہ خلاف کر دیا ہر چند بادشاہ وقت تک نے سفارش کی اور آخر میں کمرۂ عدالت پر فوج کشی تک کر نیکی دھمکی دی لیکن حاکم اجلاس ٹس سے مس نہیں ہوا۔ قانونی انصاف کا اس وقت بھی بڑا لحاظ رکھا جاتا تھا مقدر کا لکھا ہو کر رہا قید حیات اور بند غم والا شعر مرزا نے قید خانہ ہی میں موزوں فرمایا تھا۔ وہ ماحول ہی ایسا تھا مئی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا وہ حشر بپا ہوا کہ باید و شاید جہاں اور سب کچھ لٹا وہاں ڈاک بھی لٹی، مرزا خطوط نویسی کے ایسے دلدادہ تھے کہ ادھر صبح ہوئی اور کان پر رکھ کر قلم نکلے۔ چنانچہ اس ڈاک کی ڈکیتی میں اکثر مرزا کے مرسلہ خطوط اور ان کے نام فرستادہ منی آرڈر بھی غت ربود ہو گئے۔ بارے اب کچھ عرصہ سے نواب شاہپور بالقابہ اور علامہ فرشی صاحب کی مساعی سے محکمہ سی آئی ڈی اور ڈائرکٹر جنرل پتہ جات بہادر نے تلاش شروع کر دی ہے محکمہ آثار الصنادید کی کچھ ٹیم کانفرنسی کلرکوں پر بھی شبہ بتایا جاتا ہے مقام مسرت ہے کہ بہت سے گمشدہ خطوط تو مل گئے ہیں اور ان کی نقلیں باقاعدہ چھپوا کر قیمتاً تقسیم بھی کرادی گئی ہیں (بعض ان کے جواب نوازہ پوسٹ مینوں کے ہتھے چڑھ گئے) اور باقی کے لیے لاوارث خطوط کے دفتر میں چھان بین ہو رہی ہے بڑی خرابی تو یہ پیدا ہو گئی کہ دفتر مذکور میں اردو داں تو سب ہیں البتہ اردو خواں نہیں پائے جاتے خدا جانے کیا ہوا کہ رسم الخط بھول گئے۔ اب پٹنہ خانے والوں نے ازراہ تلطف غالب کے کچھ خطوط کو "دیا اگر کسی" رسم الخط میں لکھوانے کا بیڑہ اٹھایا ہے سنا ہے کہ یہ رسم خط کسنر کے ذریعہ بڑی آسانی سے پڑھ لیا جاتا ہے بہت سی صورتوں میں مکتوب الیہاں کا پتہ نہیں مرکھپ گئے۔ بیچارے! کہاں تک جدید انتظامات کا انتظار کرتے؟ مرزا نے اپنی ایک تصنیف ملکہ وکٹوریہ کی خدمت عالیہ میں جب کہ آں جہانی

نہ تھیں ایں چہائی تھیں رومن رسم الخط میں لکھوا کر یا ویسے ہی، ٹھیک معلوم نہیں، غالباً فورٹ ولیم کالج کے اساتذہ کی معرفت تعطیلات یوم کلاں میں بطور تحفہ لندن بھیجی تھی ہوا مخالف ہونے کے باعث وہ وہاں تک شاید نہیں پہنچی۔ اور یقیناً کم بخت نازیوں کے ہاتھ لگ گئی۔ اب نشریات سے معلوم ہوا ہے کہ اسے نازیوں نے بجلی اور بھاپ کے ذریعہ دیوان کی شکل میں منتقل کر لیا ہے اور اٹھا کر چھاپ دیا ہے۔

ڈاکٹر گنجوری صاحب نے کہیں یہ فرما دیا کہ مقدس ویدا اور دیوان غالب ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ہیں اس بیمان پر کئی بلوے ہوتے ہوتے رہ گئے چنانچہ بنظر امن وآشتی اس کا ہندی اتھوا ہندوستانی ترجمہ کرانے کا کام خود مہاتما گاندھی نے اپنے سر لے لیا ہے مسٹر صناح کو بھی خبر ہو گئی ہے مہاتما پہلے اس دیوان کے حروف کا مطالعہ فرمائیں گے پھر آگے پڑھیں گے اگر بڑھے تو — ایک افواہ یہ بھی ہے کہ اسے ڈاکٹر شاکر حسین امیر جادہ دلیہ کے استمزاج سے تخت کمپنی اپنے نہایت ہی عکسی انداز میں از سر نو شایع کرنیکا سودا کر رہی ہے حضور جنرل ڈیول بہادر کا بڑی بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ سر دست ایک خفیہ جیبی ایڈیشن ظاہر ایڈیشن کے نام سے گشت کر رہا ہے بڑی طیب وطاہر کتاب ہے۔

مرزا غالب اور مرزا دبیر میں مماثلت مرزائی کے باعث رشتۂ رقابت کا شائبہ پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مرزا غالب مرزا دبیر کا تو منہ کر گئے اور صرف میر انیس کے مرثیوں کا جواب لکھنے پر تلے رہے ایک ادھورا مرثیہ لکھ سکے تھے وہی یادگار غالب ہے دوسرا جو مکمل تھا اسے کم نظر ناقدین عام مراثی میں شمار نہیں کرتے اس کا ایک مصرعہ تو نہایت ہی ہلاکت آفریں تھا وہو ہذا،

کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مرزا کے مذہبی عقائد پہ بڑی لے دے ہو رہی ہے بنائے نزاع وہی ہم اسد اللّٰہم

وہم اسد اللّٰہیم والا مصرعہ اسی پر سب طبع آزمائی کر رہے ہیں متعدد مشاعرے بھی یہ طے کرنے کی غرض سے اسی مصرعہ کو طرح دیکر طے کیے جا چکے ہیں نتیجہ کے لیے ہنوز خطبۂ صدارت، گلدستہ اور روداد مشاعرہ چھپنے کا انتظار ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں ابھی تحقیقات کی گنجائش کافی ہے کیا عجب ہے کہ مرزا غالب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے خالص مرزائی ہوں اور مرزائے قادیاں سے خود اپنی زندگی میں یا مرزائے موصوف کی زندگی میں کسی وقت بیعت کر چکے ہوں۔

مرزا غالب معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت اور ہندی راشٹر بھاشا کے بھی جید عالم تھے اس لیے کہ عود ہندی مشہور کتاب انہی کی لکھی ہوئی ہے۔ دوسری کتاب دستنبو جو غالباً پنجابی زبان میں ہے بہر حال پنجاب احاطہ میں بے حد مقبول ہوئی ہے افسوس ہے کہ اب اس کے نسخے نہیں ملتے بجز چند کے جو حکیم محمل خاں مرحوم کی بیاض خاص میں محفوظ بتلائے جاتے ہیں اور جن سے انگریزی دواخانے والے ہزاروں روپیہ کما رہے ہیں۔ اسد کشتہ کا ذکر مرزا کے دیوان میں بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے جس کے استعمال سے آپ میں اس قدر حرارت غریزی بڑھ سکتی ہے کہ آپ جس کو چاہیں قتل کر ڈالیں اور جس قدر چاہیں مشق ناز فرمائیں خون دو عالم جس کی گردن پر ہوگا ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں مرزا نے ایک ڈکشنری بھی تصنیف فرمائی تھی جس کے نام میں جدید ہندوستانی جاننے والوں کی آسانی کے لیے صنعت طباق رکھی ہے یعنی اسے قاطع برہان کہیے یا برہان قاطع کم سوادوں کے لیے دونوں طرح صحیح ہے یا جبر غلط بھی سہی بہر طور ایک صنعت ضرور ہے اس ڈکشنری کے حاشیے پر مرزا نے تمام ہندوستانی لکھنے والوں پر موٹا موٹا حاشیہ چڑھا دیا یہ ڈکشنری قاموس غیاث اللغات، لغات کشوری بلکہ آکسفرڈ ڈکشنری تک سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ مرزا کو چین جاپان کی گلمریز زبانوں پر بھی کافی عبور حاصل تھا ورنہ ان کی تصانیف میں سبد چین کا نام کیوں پایا جاتا ہے۔ اقوام عالم بے حد متشکر ہوں گی اگر آئندہ "یوم چین" کے مبارک موقع پر ریڈیو سے سبدِ چین کے اقتباسات بھی نشر ہوں ناظم نشریات ذرا توجہ فرمائیں۔ اس لیے کہ پنڈت نہرو کی شہادت سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ جنرل چیانگ کائی شک کے متعلقین اس کتاب کو ہر روز اپنے سامنے رکھ کر لڑتے ہیں رہی مہر نیمروز سو وہ یقیناً پارسیوں کے مطلب کی چیز ہوگی۔ یہ بھی سنا جا رہا ہے کہ بمبئی کے مغل ہوٹلوں والے اسے اپنے بزرگان سے منسوب کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

مرزا غالب کی جملہ ادبی کاوشوں کا جواب جناب آسی ضیغر آبادی اور ڈاکٹر عبدالنفیس برسوں سے دے رہے ہیں لیکن ہنوز دے نہیں چکے ہیں ان کے استقلال کی اس عدم تکمیل کی وجہ یہی بنتے ہیں کہ سبد چیں کی موثر تنقید کے لیے چینی زبان بھی سیکھنا ناگزیر ہوگیا ہے ورنہ تنقید محض "میڈان جاپان" ہو کر رہ جائے گی، چین تک جانے کے لیے ہوائی جہاز کے کرایہ پر بھی دونوں حضرات میں کچھ جھپٹ سی ہوگئی ہے خدا کرے بربارووڈ بن جائے۔

عبارات معترضہ اور اشارات مفروضہ سے قطع نظر آمدم بر سر مطلب۔ زیر نظر دیوان غالب کہ جس کا تبصرۂ خیالی پیش کرنے کو جی لوٹتا ہے بالکل تازہ ترین نقشین غالب ہے ناشر ہو نہ ہو کوئی چنبیلی سنگھ اینڈ سنز ہوں گے لیکن چھچھوندر کی بو اس کے کسی گوشہ سے حاشا نہیں آتی۔ مفید بک ڈپو سے ملے گا جس کے واحد مالک یقیناً حضرت بدرالکلام معلوم ہوتے ہیں یا کوئی اور صاحب بھی ہو سکتے ہیں جو بقید حیات ہوں اور آزاد پیشہ ہوں سائز اعشاریہ ضرب اشاریہ ڈیمی شاہی ہے۔ کاغذ فرنچ جو خاص طور پر ملک فرانس سے شاید جنرل تیغال کی معرفت

براہ مورچہ الامان آیا ہے۔ یہ کاغذ مہوشان پیرس کے استعمال میں رہا ہے جن کی جھنکار کا عکس اس میں موجود ہے، چھپائی لکھائی عمدہ رشک ماہ و پروین طرز تحریر اچھا اسلوب بیان اچھوتا ہے، روشنائی الف خانی ہونے کے باعث الف لیلی کی سی رومانیت بین السطور میں آ گئی ہے۔ جلد البتہ اچھی نہیں بندھی، جلد ساز نے جلد بازی سے کام لے کر یا تو ابری ذرا صفائی سے نہیں چپکائی یا پھر شکنجہ میں رکھ کر دبایا ٹھیک نہیں۔ احتیاط اس میں ہے کہ مینہ بوند سے بچایا جائے اس لیے کہ جلد کا رنگ بھی کچا ہی معلوم ہوتا ہے پختہ رنگ اب آنے بند ہو گئے ہیں بجز ایک جنگ کے رنگ کے سو وہ بھی اب تو خوب کھلتا جائے ہے جوں جوں کہ اُڑتا جائے ہے ہمارا مشورہ ہے کہ اس تصنیف کو دھوپ میں بیٹھ کر مطالعہ کیا جائے۔

کتاب ہذا دور سے بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے پاس سے بھی کچھ بری نہیں جچتی شیلف میں رکھی ہوئی ضرور بھلی معلوم ہوگی پڑھنے میں کیسی نکلتی ہے یہ پڑھنے والے جانیں یا خود مصنف کہ تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں۔ خاکسار تبصرہ نویس اس کا ذمہ دار نہیں، وما علینا الاّ البلاغ قیمت صرف مبلغ یک روپیہ اور موازی دس آنے الذہ مہنگائی کی بیت دور نہ لیے ہوتی ہے۔ ممکن تو تھا کہ کچھ تخفیف بھی ہو جاتی لیکن ارباب حل و عقد اس نازک دور میں کہ لوہا اشرفی ہو رہا ہے کسی قسم کا چہ جائیکہ تخفیف کا کلہاڑا چلانا ذرا خطرناک تصور فرماتے ہیں۔ نیز اس سے محروسی مساعی جنگ پر اثر پڑنے کا بھی اندیشہ رہتا ہے بلکہ اسی اصول کے تحت پھاوڑے بیلچے تک ممنوع قرار دیئے گئے ہیں۔ بس چاہیے کہ منہ مانگے دام دیں ادھار سے معاف رکھیں کہ قرض مقراض محبت ہے۔ اور اس میں بھی وہی فولاد کا صرفہ۔ کتب خانوں کے لیے یعنی وہ جہاں کتب بھی ہوں اور خلنے بھی۔ خاص رعایت ہو دگی پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی آخر میں بیجا نہ ہوگا اگر ہم ان تمام اشخاص کا شکریہ ادا کریں جنہوں نے اس کتاب کو تالیف فرمایا کتابت کی، طباعت کی، اشاعت کی اور ریویو لکھوانے کے لیے اس کی جلدیں بندگان ہیچ مداں کے پاس جہاں تہاں بھیجیں اور از راہ عطا کہ نسیان واپس بھی نہ منگوائیں ؎ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

ہری چند اختر
بشیر مُنذِر

غالب اپنے کلام کے آئینے میں

"تنقیدِ عالیہ" کا دور دورہ ہے اور تحقیق و تدقیق کی سنگلاخ زمین میں نئے نئے پھول اور پودے اگا کر ویرانے کو گلزار بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں اسی ضمن میں مصنفوں اور شاعروں کی سوانح حیات ان کے کلام اور تصانیف سے مرتب کرنے کا شغل عام ہو چکا ہے بعض لوگوں کے خیال میں یہ حنظل سے عطر نکالنے کی کوشش کے مترادف ہے لیکن لکھنے والوں نے کتابیں لکھ ڈالیں اور ہم ابھی اظہارِ رائے کے گنبد سے باہر نہیں آ چکے ہیں

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

پس خاک از تودۂ کلاں بردار پر عمل کرتے ہوئے مرزا غالب پر قلم صاف کرتا ہوں ان کے سوانح حیات بعض حضرات بڑی تحقیق و تفتیش کے بعد کتابی صورت میں پیش کر چکے ہیں پھر بھی میرا خیال ہے کہ ان سطور میں جو کچھ مختصراً پیش کیا جا رہا ہے اسے پڑھنے کے بعد آپ مصنف کو دعائے مغفرت سے یاد فرمائیں گے۔

غالب کے حالات

نام: مرزا کا نام تمام تذکرہ نویسوں نے اسد اللہ خاں لکھا ہے چونکہ آپ ایرانی النسل تھے اس لیے اسد اللہ اور خاں کے درمیان بیگ کا لفظ بھی بڑھا دیا جاتا ہے لیکن نئے

محققوں نے اس نام کے معاملے کو بھی خاص تحقیقات کا مستحق سمجھا اور بڑی کاوش و تلاش کے بعد ثابت کر دکھایا کہ غالب کا نام احمد شاہ ابدالی یا ماؤزے تنگ نہیں بلکہ اسد اللہ خاں تھا ان کے اس انکشاف کی تائید مرزا کے اس شعر سے ہوتی ہے ؎

مارا زمانہ نے اسد اللہ خاں تمہیں ۔۔۔ وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

مرزا کا تخلص کئی غزلوں میں اسد ہے اور اکثر میں غالب اس سے پڑھے لکھے لوگوں کو شک ہو چلا تھا کہ مرزا کا دیوان دو مختلف شاعروں کے کلام کا مجموعہ ہے لیکن ہمارے نئے تذکرہ نویسوں نے بزور قلم ثابت کر دیا ہے کہ غالب اور اسد در اصل ایک شخص کے دو تخلص ہیں ـــــ البتہ ان تذکرہ نگاروں کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ مرزا پہلے اسد تھے پھر غالب بن گئے حقیقت یہ ہے کہ مرزا نے آخر تک اسد تخلص ترک نہیں کیا بلکہ مرنے کے بعد بھی سب سے پہلا شعر اسی تخلص سے کہا فرماتے ہیں ؎

یہ لاش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے ۔۔۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

پیدائش: نام اور تخلص کا مسئلہ یوں حل ہو گیا لیکن مرزا کے سن پیدائش اور عمر کے بارے میں نئے اور پرانے تمام تذکرہ نویسوں نے بری طرح ٹھوکریں کھائی ہیں سب نے غالب کا سن پیدائش ۱۲۱۲ھ ہجری لکھا ہے اور عمر ۷۳ سال لیکن یہ صریحاً غلط ہے مرزا خود کہتے ہیں ؎

تھا تعلیم درس بے خودی ہوں اس زمانے سے ۔۔۔ کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر

اس سے ظاہر ہے کہ مرزا نہ صرف قیس عامری کے زمانے میں زندہ تھے بلکہ عمر میں بھی اس سے بڑے تھے کیوں کہ جن دنوں قیس ایک مبتدی چھوکرے کی حیثیت میں مکتب کی دیواروں پر لام الف لا لکھتا تھا اس وقت مرزا صاحب بے خودی کے پروفیسر ہو چکے تھے، مجنوں کے زمانہ میں مرزا کی موجودگی کا ایک اور شعر سے بھی ثبوت ملتا ہے ؎

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام ۔۔۔ مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

ان دونوں شعروں کو ملا کر پڑھیں تو یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ مرزا غالب قیس عامری سے بہت زیادہ خوب صورت تھے پہلا شعر بتاتا ہے کہ آپ مجنوں سے عمر میں بہت بڑے تھے لیکن دوسرا شعر کہہ رہا ہے کہ لیلیٰ جو مجنوں کی محبوبہ ہونے کے علاوہ خود بھی اس پر فریفتہ تھی جب مرزا غالب کے سامنے آئی تو نوجوان مجنوں کو بہت حقیر سمجھنے لگی تھی۔ اور اس حقارت کا کھلے لفظوں میں اظہار کر دیتی تھی مرزا نے اگرچہ اسے اپنی معشوق فریبی کا کرشمہ ظاہر کرنا چاہا لیکن یہ ان کی کسر نفسی ہے اگر مرزا مجنوں کے مقابلے میں سچ مچ یوسف نہ ہوتے تو لیلیٰ پر ان کی معشوق فریبی بھی کارگر نہ ہو سکتی۔

والدین: غالب کے باپ کا نام تمام تذکروں میں عبداللہ بیگ درج ہے لیکن مرزا کے کلام سے اس پر کچھ بھی روشنی نہیں پڑتی تاہم مرزا کے باپ کا کچھ نہ کچھ نام ضرور تھا کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ اب سے کئی سو سال پہلے بھی ہندوستان میں باپوں کے نام ہوا کرتے تھے مثلاً جہانگیر کے والد کا نام جلال الدین اکبر تھا اور ہمایوں کے باپ کا نام ظہیر الدین بابر بادشاہ اس تاریخی انکشاف کے بعد اگر قافیہ کی رعایت سے اسد اللہ کے باپ کا نام عبداللہ تسلیم کر لیا جائے تو میرے خیال میں کوئی قباحت نہیں۔

مرزا کی والدہ ماجدہ کا نام کسی کو معلوم نہ ہو سکا لیکن انھوں نے اپنے ایک خط میں شکایت کی ہے کہ ایک شخص نے ان کو بڑھاپے میں ماں کی گالی دی اس سے ثابت ہے کہ غالب کی کم سے کم ایک ماں ضرور تھیں۔

تعلیم: معلوم نہیں مرزا نے تعلیم کہاں پائی، مجنوں کے زمانہ میں کوئی باقاعدہ اسکول اور کالج تو تھا نہیں صرف ایک دبستان تھا جس کی دیواروں پر مجنوں نے لام الف لکھ کر سیاہ کر ڈالی تھیں اس لیے کسی طور سے وہاں کچھ لکھنے پڑھنے کی گنجائش

ہی نہیں رہی مجنوں سے پہلے غالب نے بھی یہاں کچھ دن گزارے تھے۔ خیال ہے کہ اس مکتب کا نام "غم دل" تھا اس میں آپ داخل تو ہوئے مگر رفت اور بود سے آگے نہ بڑھ سکے، اس مکتب کا ذکر آپ نے اپنے ایک شعر میں واضح طور سے کر دیا ہے ؎

لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز　　لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

لیکن اس کے بعد مرزا گھر پر ہی پڑھتے تھے، بہر حال یہ ظاہر ہے کہ وہ جاہل نہیں تھے اگر ناخواندہ ہوتے تو شعر کیونکر لکھ سکتے تھے اور اتنی تصانیف کہاں سے آ جاتیں؟ آب حیات والے محمد حسین آزاد نے بھی صرف بہادر شاہ ظفر کے اشعار کو ذوق کی تصنیف بنایا ہے غالب کے بارے میں اس حسن ظن کا اظہار نہیں کیا۔

غالب نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں پس وہ تھوڑی بہت دونوں زبانیں جانتے تھے البتہ اپنی ایک کتاب کا نام "عود ہندی" رکھنے سے ظاہر ہے کہ تحریر و تصنیف میں اردو کو ہندی لکھا کرتے تھے چنانچہ مردم شماری کے وقت انھوں نے اپنی مادری زبان ہندی لکھوائی تھی۔

پیشہ اور شغل: مرزا کا سب سے بڑا اور مستقل پیشہ تو عاشقی تھا جس کا ثبوت ان کے دیوانوں میں جا بجا ملتا ہے دوسرا شغل یہ تھا کہ شعر چن چن کر رسوا ہوتے رہتے تھے خود مانتے ہیں کہ ؎ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اس کے علاوہ بعض اور اشغال بھی تھے ـــ مرزا کوئی ہنرمند آدمی نہیں تھے لیکن اس کے باوجود فلک ناہنجار آپ کی دشمنی پر تل گیا تھا فرماتے ہیں ؎

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے　　بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

البتہ فن مصوری میں کچھ دسترس حاصل کی تھی ایسا کیوں کیا تھا اس کا جواب خود دیتے ہیں ؎

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری　　تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

ایک مدت تک یہ شیوہ رہا کہ صبح سویرے ضروریات سے فارغ ہوتے ہی کان پر قلم رکھ کر نکل کھڑے ہوتے اور سارا سارا دن بلامعاوضہ لوگوں کے خط لکھتے پھرا کرتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی سوشل سروس لیگ، کے ممبر بن گئے تھے مقصد یہ تھا کہ ؎ مگر لکھوائے کوئی ان کو خط تو ہم سے لکھوائے

ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ایک شعر سے پتہ چلتا ہے کہ ابنائے روزگار کی بے مہریوں سے تنگ آکر گداگری بھی اختیار کی لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ اس حالت میں بھی عاشقی کو ترک نہیں کیا کہتے ہیں ؎ چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی

سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

قیس: لڑکپن کا زمانہ گزرا جوانی آئی سرخ سرخ اور گرم گرم خون رگوں میں ایک تلاطم پیدا کرنے لگا مرزا سے نہ رہا گیا اور عشق نامی ایک شہ زور حریف پر فتح حاصل کرنے کی ٹھان لی فریقین کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان میں اترے گھمسان کا رن پڑا مگر افسوس کہ مرزا کے پاؤں پر ایک زخم کاری آگیا اور آپ شکست کھا گئے اس وقت نہایت مایوسی کے عالم میں بے ساختہ پکار اٹھے ؎

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھیرا جائے ہے مجھ سے

آپ کا ہتھیار ڈالنا تھا کہ حریف نے آپ کو گرفتار کر لیا اور پابجولاں اپنے قلعہ کی طرف لے گیا۔ تماشائیوں کا ایک بہت بڑا مجمع ساتھ ہو لیا کیوں کہ یہ بات زبان زد خاص وعام ہو چکی تھی کہ مرزا غالب کے وہاں خوب پرزے اڑیں گے۔ اور عین مجمع میں آپ کی رسوائی ہوگی مگر وہاں کچھ بھی نہ ہوا اور تماشائی بے نیل و مرام یہ کہتے ہوئے واپس لوٹ آئے ؎

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑینگے پرزے دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

موثق ذرایع سے معلوم ہوا ہے کہ حریف نے آپ کو جیل میں قید کر دیا۔ مگر قید کا عرصہ معلوم نہیں ہو سکا البتہ جو ظلم آپ سے روا رکھے گئے ان کے متعلق آپ نے ہلکا سا اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں ؎

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

یعنی بکمبخت حریف نے آپ کے پاؤں کے نیچے آگ تک رکھنے سے دریغ نہیں کیا۔

اس قید سے آپ کو کئی بار ضمانت پر رہا کیا گیا مگر آپ کا دل ہر بار "فراغ" سے دیرینہ دشمنی کی بنا پر کوئی شرارت کر دیتا اور مع دل و دماغ دھر لیے جاتے جیسا کہ آپ فرماتے ہیں ؎

سو بار بند قید سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

خیال کیا جاتا ہے کہ آخری وقت فراغ سے صلح ہو گئی ہوگی۔

مختصر حالات : اب مرزا کے مختصر سوانح حیات سنیے بخوف طوالت صرف چند واقعات کے بیان پر ہی اکتفا کروں گا جو عام محققوں اور تذکرہ نویسوں کی نظر سے اوجھل رہے۔

مرزا کی زندگی اگرچہ عسرت میں گزرتی تھی لیکن اس کے لیے اللہ میاں ذمہ دار نہ تھے خود مرزا کو اقرار ہے کہ خدا نے تو انہیں دونوں جہان دے دیئے تھے سنیے ؎

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ دونوں جہان گئے کہاں؟ جواب مرزا کے اس شعر میں موجود ہے

تو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

پس دونوں جہان بھی گھر کے ساتھ ہی لٹا دیئے ہوں گے۔

غالب کا گھر نہ صرف ویران تھا بلکہ اس میں ویرانی سی ویرانی تھی چنانچہ ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

لیکن یہ گھر وسیع نہ تھا اور مرزا کو ورزش کے لیے یا شاید گنبد بلا کھیلنے کے لیے بہت کھلی جگہ کی ضرورت تھی اس لیے جنگل میں جا رہے سنئے فرماتے ہیں ؎

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم   دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

جنگلوں کی زندگی مرزا کو بہت عزیز تھی اور انھوں نے اپنے گھر کو طاق نسیاں پر رکھ کر قفل لگا دیا تھا، مرزا کے پاؤں میں چکر تھا وہ کسی جگہ بیٹھ نہیں سکتے تھے، جب چلتے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے تو اس وقت انھیں جھاڑ جھنکاڑ کی تلاش ہوتی تھی کانٹوں کو دیکھ کر آپ کا دل مسرت و شادمانی کے جھولے میں جھولنے لگتا تھا کہتے ہیں ؎

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں   جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

عادات: مرزا بڑے سادہ لوح اور صاف دل انسان تھے اکثر ایسی حرکتیں کر بیٹھتے جن کا نتیجہ ان کے حق میں بہت برا ہوتا تھا چنانچہ ایک دن محبوب کی گلی میں بیٹھے بیٹھے کسی ذرا سی غلطی پر پاسبان سے اپنی چندیا گنجی کرائی۔ اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے   اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

ایک مرتبہ خود محبوب کے ہاتھوں سے بھی پٹے مگر چونکہ قصور اپنا تھا اس لیے نہایت ایمانداری سے اعتراف بھی کر لیا کہ ؎

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں   ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن

اس سادہ لوحی کی بدولت ایک دن محبوب کی حد سے زیادہ تعریف کر کے ایک راز دار کو رقیب بنا لیا، ثبوت ملاحظہ ہو ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا   بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

لیکن دیوانہ بکار خویش ہشیار کبھی کبھی رقیب کو جل بھی دے جاتے ؎

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو   دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

مرزا نجوم اور جوتش کے نہ صرف قائل تھے بلکہ محبت کے معاملوں میں بھی جوتشیوں سے

پوچھ گچھ کرتے رہتے تھے اسی لیے کہا ہے ؎

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض   اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

غالب کا دل: غالب کا دل عام لوگوں کی طرح خون کا قطرہ یا گوشت کا لوتھڑا نہ تھا بلکہ آفت کا ایک بڑا سا ٹکڑا تھا اس میں کئی جگہ ٹیڑھے میڑھے تھے اور وہ ہر وقت شور و غل مچائے رکھتا تھا۔ مرزا بھی اس کی آوارگی کے ہمیشہ شاکی رہتے تھے ارشاد ہوتا ہے ؎

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے

عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا!

مرزا کبھی کبھی اپنے اس دل سے کام بھی لے لیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک دفعہ محبوب کی تمنا کہیں آپ کے ہتھے چڑھ گئی آپ نے جی بھر کے انتقام لیے اور دل کے شور و غل کے ذریعے اس بے چاری کے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ رات دن دل میں چکر کاٹتی مگر باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ آخر ایک دن خود اس پر ترس کھا کر محبوب سے درخواست کی ہے ؎

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب   رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

لیکن خدا کے فضل و کرم سے مرزا کو جلد ہی اس سے رہائی مل گئی ایک دن بیٹھے بیٹھے سوزِ نہاں کا دورہ ہوا اور سارے کا سارا دل بے محابا جل گیا اس حادثۂ فاجعہ کا ذکر مرزا نے یوں کیا ہے ؎

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا   آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

بدقسمتی سے مرزا کے ناخن بہت جلد جلد بڑھتے تھے چنانچہ دل کا زخم ابھی بھرنے بھی نہ پاتا تھا کہ ناخنوں کے کھرپے پھیر پھر ہرا ہو جایا کرتے تھے فرماتے ہیں ؎

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا   زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

غالب کا زمانہ: غالب کے زمانے میں دلی میں غم الفت کا قحط پڑ گیا تھا فرماتے ہیں ؎

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

افسوس کہ سارے دیوان میں یہ کہیں وضاحت نہیں کی گئی کہ غم الفت بادشاہ کے توشہ خانہ میں موجود تھا یا وہاں بھی جھاڑو پھر گئی تھی۔ نیز یہ کہ راشن کی دکانوں پر کس بھاؤ بکتا تھا۔ البتہ یہ صاف ظاہر ہے کہ مرزا کی خوراک غم الفت تھی یا کم از کم غم الفت ان کی خوراک کا جزو اعظم تھا۔

لیکن اس قحط سالی میں بعض چیزوں کی ارزانی بھی تھی مثلاً دل اور جان بازار میں بکا کرتے تھے اور ہر شخص جب اور جتنے چاہے خرید سکتا تھا مرزا کو اعتراف ہے ؎

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

غالب کے زمانے میں پورے سات آسمان تھے آج کل نو آسمان بتائے جاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ باقی دو آسمان ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی عہد میں ولایت سے بن کر آئے مرزا کے زمانے کے ساتوں آسمان ایک لحظہ بھی سکون و قیام کی لذت سے آشنا نہ ہوتے بلکہ رات دن گھومتے رہتے تھے مرزا لکھتے ہیں ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اس زمانے کی ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ تھی کہ کسی کو محبوب کا منہ معلوم نہ ہو سکے تو اس کی ہیچمدانی کھل جاتی تھی ایک مرتبہ مرزا پر بھی یہ کیفیت گزر گئی اعتراف فرماتے ہیں ؎

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا کھل گئی ہیچمدانی میری

مرزا غالب خوبصورت مجنوں کے مقابلے میں تو تھے جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے مگر کچھ زیادہ خوبصورت نہ تھے، یعنی قضا و قدر کی طرف سے انہیں حسن کا کوئی وافر حصہ نہیں ملا تھا اس کا احساس خود انھیں بھی تھا اپنی صورت اور حسینوں کی چاہت کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

لیکن کسی مصلحت کے تحت ایک عدد محبوب کے عاشق بن بیٹھے تھے۔

غالب کا محبوب: مرزا کا محبوب بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا اس کا نام سارے جہان کو معلوم تھا لیکن کسی ملک کسی شہر اور کسی تھانے میں کوئی شخص اس کا نام ستمگر کہے بغیر نہ لیتا تھا ؎

کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

اس محبوب کے عادات و خصائل بھی عجیب تھے مثلاً گالیاں بہت دیتا تھا مرزا پوچھتے ہیں ؎

واں گیا میں بھی تو ان کی گالیوں کا کیا جواب یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

اسی طرح اگر مرزا کبھی شکوہ شکایت کریں تو وہ فوراً اٹھ کر بھاگتا اور ریلیماران سے باڑہ ہندو راؤ تک مرزا کے جتنے رقیب ہوتے ان سب کو جمع کر لیتا مرزا جھنجھلا کر کہتے ہیں ؎

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

جب کبھی وہ رقیب کی بغل میں سوتا تو مرزا کے خواب میں آ کر پنہاں تبسم کیا کرتا اسی لیے کہا ہے ؎

بغل میں غیر کی آپ آج سوئے ہیں ورنہ سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

یہ معشوق تخت کرسی مونڈھے یا چارپائی پر بیٹھنا پسند نہ کرتا تھا ہمیشہ بوریے پر بیٹھتا اور اگر بوریا نہ ملے تو کھڑے کھڑے چل دیتا مرزا رو رہے ہیں کہ ؎

ہے خبر گرم ان کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

یوں بھی وہ اچھا خاصا احمق تھا عشق و محبت کے سیدھے سادھے معاملات بھی نہ سمجھ سکتا تھا مرزا شاکی ہیں کہ ؎

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

آخر میں وہ بے طلب بوسے بھی دینے لگا تھا مرزا کی بدگمانی بھری شہادت حاضر ہے ؎

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو　　　دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کیے

معشوق کی صحت اچھی نہ تھی اکثر رعشہ وغیرہ کا شاکی رہتا تھا ایک دن بڑی منتوں کے بعد مرزا کے قتل پر راضی ہوا نوک شمشیر سے دو چار کچوکے دینے کے بعد کاری زخم لگانے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ فالج گرا اور ڈھلا چنگا ہاتھ پیر تسمہ پا کی ٹانگ بن کر لٹکنے لگا مرزا کی رنج و غم کے مارے چیخ نکل گئی ؎

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا　　　دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے

لیکن کچھ عرصے کے بعد فالج کا اثر ختم ہو گیا اور ہاتھ پہلے کی طرح کام کرنے لگا۔

اس کے مذہب کے متعلق صرف یہ پتہ چلا ہے کہ غیر مسلم تھا جبھی تو کہا ہے کہ ؎

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ　　　غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

بین الاقوامی شہرت کے باوجود شروع شروع میں اس کا گھر گھاٹ کہیں نہیں تھا بلکہ ایک خیمہ میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا مرزا فرماتے ہیں ؎

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے　　　مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

لیکن بعد میں اسے کوئی مکان الاٹ کر دیا گیا تھا جس میں سنگ در و دیوار تھے اور ایک پاسبان بھی۔

مرزا کی بڑی خواہش تھی کہ آپ کو بھی محبوب کے دروازے پر تھوڑی بہت جگہ مل جائے چنانچہ ایک دن باتوں ہی باتوں میں نہایت مایوسی کے عالم میں محبوب سے کہا ؎

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں　　　خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

محبوب نے کمال نوازش سے آپ کو دروازے پر رہنے کی اجازت دیدی لیکن اس کے بعد فوراً ہی جب کہ آپ اپنا بستر کھول رہے تھے صاف انکار کر دیا اور اپنی زبان واپس لے لی۔ ہو سکتا ہے کہ مرزا نے کوئی چبھتی ہوئی شرارت کر دی ہو اس قصہ کو

ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؂

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

لیکن مرزا ایسے نہ تھے کہ اٹھ جاتے آپ دھرنا دے کر بیٹھ گئے اور تماشائیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ؂

اس فتنہ خو کے در سے تو اٹھتے نہیں اسد اس میں ہمارے سر پر قیامت ہی کیوں نہ ہو

اس پر محبوب نے ظلم و تشدد میں اضافہ کر دیا اور نئے طریقوں سے درپئے آزار ہو گیا یہاں تک کہ آپ کی قوت برداشت نے جواب دے دیا اپنا بستر لپیٹا اور محبوب کے راستے پڑ پر جما دیا مگر وہاں بھی اس ظالم نے پیچھا نہ چھوڑا اور اٹھ جلد پر مصر ہوا چونکہ معاملہ اب نازک صورت اختیار کر گیا تھا لہذا آپ محلہ کی پنچایت کی طرف رجوع ہوئے اور بڑی انکساری کے ساتھ پوچھا ؂

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ پنچائت نے نہایت ستم ظریفی سے کام لیا اور اس معاملے میں آپ کے محبوب کی طرفداری کی اس طرح آپ کو وہاں سے بستر اگول کرتے ہی بنی روتے دھوتے اٹھے اور سنگ دل محبوب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ؂

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

اس کے بعد آپ گھر لوٹ آئے مگر گھر میں بھلا جی کب لگتا اور اس پر طرہ یہ کہ ہمسایوں نے تنگ کرنا شروع کر دیا واقعہ دراصل یہ ہے کہ اکیلے آدمی کو کوئی شریف اپنے ہمسایہ میں کبھی نہیں رہنے دیتا۔

بڑی ٹوہ لگائی گئی مگر یہ پتہ نہ چل سکا کہ مرزا کا پری زاد بھی خلد میں حور بنا، یا نہ بنا؟

چند متفرق واقعات: ایک مرتبہ مرزا نے اڑنے کی بھی کوشش کی لیکن ہوائی جہاز نے

وغیرہ سے کام نہیں لیا کسی اور طریقے سے اڑے جس کا نسخہ اور ترکیب استعمال وغیرہ سینہ بسینہ ان تک پہنچ کر ان کے ساتھ ہی دفن ہو گئے بہر حال اڑے تو سہی لیکن پھر زمین پر آ رہے کچھ عرصے کے بعد برے اعمال کی پاداش میں انہیں جانور بنا دیا گیا اس زمانہ میں آپ کو اپنا آبائی گھر بار چھوڑ کر لہلہاتے اشجار پر گھونسلہ بنانا پڑا مگر شومئ قسمت سے آپ کے گھونسلے کے قریب ہی صیاد نے جال بچھائی مرزا گھونسلہ بناتے بناتے تھک گئے تھے اور کئی دن سے ایک کھیل بھی مُنہ میں اُڑ کر نہیں گئی تھی اس لیے بھوکے اور پیاسے نڈھال تو تھے ہی دانے کو دیکھ کر جھٹ نیچے اترے اور اترنے کے ساتھ ہی گرفتار ہوئے اور پھڑ پھڑا کر وہیں رہ گئے پھر مضمحل سی آواز میں کہا ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

صیاد نے آپ کو پکڑا اور گھر لا کر پنجرہ میں قید کر دیا نہ معلوم کتنے عرصے تک وہاں اکیلے ہی گلتے سڑتے رہے کہ ایک دن صیاد ایک اور جانور کو پکڑ لایا اور مرزا کے ساتھ ہی قفس میں بند کر دیا معمولی علیک سلیک کے بعد آپ نے اس سے چمن کا حال احوال دریافت کیا وہ بیچارہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور رندھی ہوئی آواز میں بہاروں کی داستان بیان کرنے لگا اور مرزا صاحب بڑے انہماک سے سنتے رہے آخر وہ کہنے لگا کہ آشیانہ میں ایک گلشن پر بجلی ...... اس سے آگے وہ کچھ نہ بول سکا اور اس کے الفاظ ہچکیوں میں تبدیل ہو کر رہ گئے اس کی آنکھوں سے آنسو اس طرح جاری تھے جیسے ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی ہو کافی زار و قطار رونے کے بعد جب اسے ذرا کچھ ہوش آیا تو میرزا نے اس سے کہانی جاری رکھنے کو فرمایا مگر وہ سہم گیا اور اپنی نظریں مرزا کے چہرے پر گاڑ دیں آپ سارا معاملہ سمجھ گئے اور اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولے ؎

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مرزا کا ایک دربان بھی تھا جب مرزا کا گھر ویران ہو گیا تو اس کے لیے کوئی کام نہ رہا مگر یہ تھا وفادار مرزا کا ساتھ نہ چھوڑا اور گھر ہی سے گھاس کھود کھود کر گزر اوقات کرتا رہا مرزا فرماتے ہیں ؎

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر　　مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

غالب نے کئی مرتبہ بہشت کی بھی سیر کی ایک مرتبہ وہاں سے واپس آئے تو محبوب سے کہنے لگے ؎

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت　　یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

خواجہ خضر سے بھی مرزا کی اکثر ملاقاتیں ہوئیں نصرت الملک کے قصیدے میں ارشاد ہوتا ہے ؎

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا　　گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

لیکن دوسرے مصرع میں شرف کا لفظ محض دوستانہ مروت کے بارے کیا ہے ورنہ دراصل وہ خضر کو رہنمائی کے قابل نہ سمجھتے تھے ثبوت حاضر ہے ؎

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں　　مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

مرزا بزدل بھی بہت تھے ایک مرتبہ سڑک پر راہزن کا سامنا ہو گیا تو اسے دیکھتے ہی دم دبا کر بھاگ نکلے لیکن دوڑ دھوپ کے باوجود پکڑے گئے اب ستم ظریف نے مارنے ڈانٹ کر کہا: "کمبخت ہمیں اس قدر دوڑایا ہے لے اب ذرا پاؤں داب اس واقعہ کو یوں نظم کیا ہے ؎

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ　　ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

جب ان کی تھکاوٹ دور ہو گئی تو انھوں نے مرزا سے کہا کہ ہمیں اپنے گھر لے کر چل مرزا نے ایسا ہی کیا وہاں پہنچ کر ان لوگوں نے مرزا کا سارا اثاثہ اڑا لیا اور چمپت ہو گئے۔ مرزا ان کے اس برتاؤ سے بہت خوش ہوئے اور چادر میں منہ لپیٹ کر سو رہے صبح بستر سے اٹھتے ہی یہ شعر گنگنانے لگے ؎

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا　　رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

مرزا اپنے رقیب کے دروازے پر ایک کم نہ ایک زیادہ پورے ہزار مرتبہ گئے

شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب بھی اتنی ہی بار وہاں گیا ۔

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار　　اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں

کچھ مدت مرزا کی عسرت نے یہ شدت اختیار کر رکھی تھی کہ بے چارے دلی کی گلیوں میں بالکل ننگ دھڑنگ پھرتے رہے ایک دن اسی حالت میں بادشاہ بہادر شاہ کے دربار میں جا پہنچے اور بہادر شاہ ظفر سے شکوہ کیا ۔

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا　　آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

اس پر بادشاہ نے آپ کو ایک بڑا سا کرتا سلوا دیا جس کا دامن اتنا بڑا تھا کہ اس کا ایک سرا دھونے میں ہی پورا دریا خشک ہو گیا اس پر ارشاد ہوا ۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک　　میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

اس زمانہ میں دریائے جمنا کا نام دریائے معاصی تھا اور مرزا وہیں کپڑے دھونے جایا کرتے تھے۔

دریائے گنگا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پہلے یہ سورگ لوک میں بہتا تھا اور سری رام چندر جی کے ایک بزرگ مہاراجہ بھاگیرتھ تپسیا کے زور سے اسے زمین پر لائے تھے اب دریائے جمنا کے ظہور کا حال مرزا سے سن لیجے کہتے ہیں کہ میری وحشت کے لیے عرصۂ آفاق بھی تنگ ہو گیا تو زمین کو بڑی شرم آئی حتیٰ کہ اس کی پیشانی پر بڑے زور کا پسینہ آ گیا بس وہی دریا بن گیا ۔

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا　　دریا زمین کو عرق انفعال ہے

مرزا کا محبوب کہیں کعبہ کے گرد و نواح میں سکونت پذیر تھا چنانچہ جب کبھی مرزا کو دربار پر ڈانٹ ڈپٹ ہوتی تو وہ کعبے کی جانب چل دیتے کہا ہے ۔

اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں　　اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے

اس طرح آئے دن محبوب کے گھر اور کعبۃ اللہ جانے آنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں کعبہ دلی سے بہت قریب تھا بعد میں گرمی کی شدت سے زمین پھیل گئی تو دلی

اور یکّے کا درمیانی فاصلہ بھی بڑھ گیا یا پھر مرزا کو کوئی بہت ہی تیز رفتار سواری مل گئی ہوگی۔

مجنوں عمر میں تو مرزا سے چھوٹا تھا ہی مگر اس کا انتقال بھی مرزا کے سامنے ہی ہوا مرزا مجنوں کے مرنے کے بعد کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں ؎

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

موت: مرزا کی موت کا معاملہ ذرا پیچیدہ ہے مختلف لوگوں نے ان کے اشعار سے مختلف مطالب اخذ کیے ہیں کچھ کا کہنا ہے کہ آخر میں مرزا کے دوستوں نے انہیں مشورہ دیا کہ اب جینے سے کیا حاصل؟ بہتر یہی ہے کہ آپ مر جائیں اور اس دار المحن کے جھمیلوں سے نجات پائیں لیکن مرزا نے الٹا ان کو بیوقوف بنایا اور فرمایا ؎

ناداں ہیں جو کہتے ہیں کہ کیوں جیتے ہو غالبؔ قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

مگر نہ جانے ایک دن کیا سر میں سمائی کہ خود بخود اس کار خیر کے لیے کمر بستہ ہو گئے اور باوجود مفلسی کے ایک تلوار اور کفن بھی خرید لیا کفن کو سر پہ باندھ لیا اور تلوار بغل میں لٹکائی اور دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہوئے فرمانے لگے ؎

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

اس مجاہدانہ شان سے جب محبوب کی بارگاہ میں داخل ہوئے اور اپنی عرضداشت پیش کی تو وہ بہت برہم ہوا پیچ و تاب کھا کر تالی بجائی فوراً مسلح سپاہی حاضر ہو گئے حکم ہوا نکال دو اسے کہیں اور جا کر قسمت آزمائی کرے کیونکہ ہم نے آجکل تلوار اٹھانا چھوڑا ہوا ہے (شاید محرم کا مہینہ ہوگا) مسلح سپاہی مرزا پر پل پڑے اور دھکے دے دیکر دربار بدر کر دیا آپ محبوب کی طرف مخاطب ہوئے اور دونوں ہاتھ باندھ کر گڑگڑانے لگے ؎

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

مگر وہ ایسا سنگ دل انسان واقع ہوا تھا کہ مرزا کی ایک نہ سنی آپ کے لیے یہ کوئی کم صدمہ نہیں تھا سو چا سارے شہر میں دھوم مچی ہوئی ہے کہ مرزا غالب آج محبوب کے ہاتھوں قتل ہونے کو گئے ہیں واپس جا کر انہیں کیا منہ دکھاؤں گا چنانچہ محبوب کی محل سرا کی دیواروں کے ساتھ (جہاں آپ پہلے بھی اکثر آ بیٹھتے تھے) ٹکریں مارنا شروع کر دیں اور اسی طرح اپنی جان شیریں جان آفریں کے سپرد کر دی۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ غلط ہے کیونکہ مرزا بیچارے کی موت تو غریب الوطنی کی حالت میں ہوئی تھی انھوں نے خود کہا ہے ؎

مارا دیار غیر میں مجھکو وطن سے دور   رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

مرض موت کے بارے میں خیال ہے کہ آخر عمر میں وحشت کے دورے پڑنے لگے تھے اور اسی حالت میں ایک دن سر پھوڑ پھوڑ کر مر گئے، مرتے ہی یہ ارشاد ہوا:

مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے   بیٹھنا آ کے وہ اس کا تری دیوار کے پاس

مرزا کی روح کے پرواز کرنے سے پہلے ہی ان کے رقیبوں نے جا کر معشوق سے کہہ دیا کہ مرزا جاں کنی کے عالم میں ہیں اس کو جب یہ حال معلوم ہوا تو مروت نے جوش مارا اور وہ دوڑا ہوا مرزا کے پاس آیا لیکن اس غریب میں ایک نظر دیکھنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی تھی چنانچہ یہ شعر پڑھا اور ہمیشہ کی نیند سو گئے ؎

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب

خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

انا للہ وانا الیہ راجعون

یہ خبر آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی لوگ بازاروں اور گلیوں میں ایک دوسرے سے کہتے جاتے تھے ؎

اسد اللہ خاں تمام ہوا   اے دریغا وہ رند شاہد باز

یہ "رندِ شاہد باز" ہونے ہی کی وجہ تھی کہ نعش کئی گھنٹے تک بے گور و کفن پڑی رہی کسی نے تجہیز و تکفین کا انتظام نہ کیا آخر آپ کے محبوب کو ترس آ گیا اور وہ پوری تمکنت سے اٹھا اور نعش کے پاس کھڑے ہو کر کہا ؎

یہ نعش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

کفن دفن کا انتظام کر کے جب مرزا کو کفنایا گیا تو آپ جھٹ بول اٹھے ؎

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

محبوب نے اپنی گلی کے عین درمیان آپکی قبر کھدوانا شروع کر دی لیکن آپ بھی کوئی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں تھے جھٹ باآواز بلند اس نامعقول حرکت پر پر زور احتجاج کرتے ہوئے فرمانے لگے ؎

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعد مرگ میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

محبوب بہت سٹپٹایا اور اسے غدا جھوٹ نہ بلوائے مرزا پر غصہ آ گیا کہنے لگا عجیب قسم کا آدمی ہے زندگی میں بھی آرام کا سانس نہیں لینے دیا اور اب مرنے پر بھی اس کے وہی طور اطوار ہیں لیکن چونکہ مرزا صاحب مرنے کے بعد وصیت فرما رہے تھے اس لیے ان کی بات کو رد کرنا مناسب نہ سمجھا اور قبرستان میں لے جا کر دفنا دیا

مرزا کے بعد شہر والوں کی عجیب حالت تھی وہ آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے اور سر دیواروں سے پٹختے تھے ہائے ہائے کی صداؤں سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے مگر یکایک ان میں کچھ ایسی تبدیلی ہوئی کہ وہ سب کے سب کہنے لگے ؎

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

مگر خدا لگتی تو یہ ہے کہ مرزا غالب کو یہ لوگ ہزار کوشش بھی نہ بھول سکے اور آپکی ہنسنے ہنسانے والی باتیں انہیں اکثر یاد آتیں اس وقت وہ بول اٹھتے ؎

ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہے وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

مرزا نے مرنے کے بعد بھی بہت سے شعر کہے اور کسی نہ کسی طرح اپنے شاگردوں کو پہنچاتے رہے انھوں نے دیوان میں شامل کر لیے۔

"حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد"

یہ ساری غزل مرنے کے بعد لکھی گئی اس سے قبل کے دو شعر اور حاضر ہیں ؎

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعد مرگ ۔۔۔ ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد ۔۔۔ مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

کلام پر تبصرہ: مرزا غالب کے کلام پر سیکڑوں بلکہ ہزاروں تبصرے ہو چکے ہیں مگر یہ بات آج تک کسی کے ذہن میں نہیں آئی کہ مرزا کے کلام میں گرمی بہت ہے اور یہ گرمی آپ اس لیے پیدا کرتے تھے جو شخص آپ کے شعر پر انگلی رکھے فوراً شعر کی حدت سے انگلی جل جائے اور دوبارہ اسے جرأت نہ ہو سکے چنانچہ خود ارشاد فرمایا ہے ؎

لکھتا ہوں اسد سوزشِ دل سے سخن گرم

تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

آپ کے کلام کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مزا بہت ہے اور یہ مزہ اس لیے پیدا ہو گیا تھا کہ آپ ایک "خسرو شیریں سخن" نامی شخص کے پاؤں کی میل دھو دھو کر پیا کرتے تھے جس کا انہیں خود اعتراف ہے فرماتے ہیں ؎

غالب مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو؟

پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں

حاجی لق لق

غالب اینڈ گوئٹے

مجھ سے روایت کیا کامریڈ باری علیگ نے اور انھوں نے سُنا اپنے دوست مرزا کاظم سے اور مرزا کاظم نے سنائی آپ بیتی اور اب آپ مجھ سے سنیے "مرزا بیتی" میرے الفاظ میں اور اس کا ثواب پہنچائیے غالب اور گوئٹے کی ارواح کو اور دعا کیجیے میرے حق میں۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

مرزا کاظم جن دنوں برلن میں تھے ان ایام کا ذکر ہے کہ مرزا صاحب کی ملاقات ایک پنجابی سکھ پریتم سنگھ سے ہوئی اور دونوں تین چار روز تک ایک قہوہ خانے میں ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ایک روز سردار جی نے مرزا صاحب سے کہا کہ بھائی صاحب! بات یہ ہے کہ میں اٹلی جانا چاہتا ہوں اور میرے پاس پیسہ کوئی نہیں۔ اٹلی میں میرا مستقبل بہت شاندار ہو سکتا ہے۔ اس لیے اگر آپ کچھ روپیہ مجھے بطور قرض دے دیں یا کسی دوست سے دلا دیں تو میں اٹلی پہنچ کر تھوڑے ہی عرصے میں یہ قرض چکا دوں گا۔

مرزا کاظم نے ایک لمحہ بھر سوچنے کے بعد کہا "قرض؟ سردار صاحب! یہاں پردیس میں کون ایسا ہندوستانی فارغ البال ہو سکتا ہے جو اپنے اللّے تللّوں کے علاوہ کسی دوست کو قرض دے سکے؟"

سردار جی: "مجھے کوئی زیادہ روپیہ نہیں چاہیے۔ صرف ...."

مرزا صاحب: (بات کاٹ کر) "اجی کم زیادہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ کسی سے ایسی درخواست کرنا ہی بے معنی چیز ہے"۔

سردار جی: (مایوسی کے لہجے میں) "تو پھر کیا کیا جائے؟"

مرزا صاحب: "کیا کیا جائے بہت کچھ ہو سکتا ہے"۔

سردار جی: (پُر امید نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) "وہ کیا، وہ کیا؟"

مرزا صاحب: "وہ یہ کہ ہندوستانیوں کی بجائے جرمنوں سے روپیہ حاصل کیا جائے، جو بہت آسان کام ہے"۔

سردار جی: "وہ کیسے؟"

مرزا صاحب: "میں کل بتاؤں گا۔ آپ اسی وقت یہاں تشریف لے آئیے"۔

(سردار جی کی آنکھیں ان الفاظ کو سن کر چمک اٹھیں اور آپ مرزا صاحب کا "پیشگی" شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے۔

رات بھر سردار جی کو نیند نہ آئی۔ اور دوسرے دن وقت مقررہ سے آدھ گھنٹہ پہلے ہی قہوہ خانے میں پہنچ گئے اور بے صبری کے ساتھ مرزا کاظم کا انتظار کرنے لگے۔ آخر مرزا آئے اور قہوہ کی پیالی پیتے ہوئے یوں گویا ہوئے):

مرزا صاحب: "دیکھیے سردار جی! مرزا غالب ہندوستان کے بہت بڑے شاعر تھے آپ جانتے ہی ہوں گے؟"

سردار جی: "وہی نا جنہیں انڈین شکسپیر کہتے ہیں؟"

مرزا صاحب: (مسکراتے ہوئے) "نہیں نہیں۔ انڈین شکسپیر تو آغا حشر کاشمیری مرحوم تھے جو مشہور ڈراما نویس تھے۔ غالب ان سے بہت پہلے عہدِ مغلیہ میں گزرے ہیں۔ آپ کا نام اسد اللہ خاں تھا اور وطن دہلی۔ آپ فارسی

اور اُردو دونوں زبانوں کے بہت بڑے شاعر تھے۔ لیکن عمر تنگ دستی میں گزری، آپ کو شراب نوشی کا بہت شوق تھا۔ اس لیے کبھی فارغ البالی نصیب نہ ہوئی"!

سردار جی: "بالکل میرے چچا ہرنام سنگھ کی طرح، ذیلدار تھا۔ دو سو بیگھہ زمین تھی۔ ضلع بھر میں عزت تھی۔ لیکن شراب نے بیڑا غرق کر دیا۔ آج اسے کوئی دس روپے اُدھار نہیں دیتا"!

مرزا صاحب: "ہاں ہاں بس غالب کی بھی یہی حالت تھی۔ لیکن تھا بڑا خوددار۔ مرتا مر گیا لیکن اُمراء کے سامنے نہ جھکا۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی کہ ......"

سردار سر تو ہلاتے جاتے تھے لیکن دل میں سوچتے تھے کہ بات تو جرمنوں سے روپیہ حاصل کرنے کی تھی۔ یہ مرزا صاحب غالب کا قصہ کیوں چھیڑ بیٹھے؟ آپ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ مرزا کاظم نے ان کے دل کی بات کو بھانپ کر ہاتھ سے اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ خاموشی سے سنتے جلیئے۔

مرزا صاحب: "غالب ایک فلاسفر شاعر تھے اور انھوں نے وہی زمانہ پایا جو جرمنی کے فلاسفر شاعر گوئٹے کو نصیب ہوا۔ گوئٹے بھی ......"

مرزا صاحب یہاں تک کہہ پائے تھے کہ سردار جی سے صبر نہ ہو سکا اور انھوں نے بات کاٹ کر اپنی بات شروع کر دی۔

سردار جی: "لیکن مرزا صاحب! جہنم میں جائیں غالب اور گوئٹے، آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ جرمنوں سے روپیہ حاصل کرنے کی ترکیب بتائیں گے"!

مرزا صاحب: "بالکل درست، اور میں وہی ترکیب تو بتا رہا ہوں۔ آپ ذرا سنتے جایئے۔ آپ ہندوستان کے بہت بڑے مورخ، شاعر اور ادیب ہیں"۔

سردار جی: "میں اور شاعر؟"

مرزا صاحب: "بس آپ چپ رہیے، اور میری بات سنیے، آپ اتوار کے دن

"ہومبرگ ہال" میں ایک تقریر کریں گے جس میں آپ غالب اور گوئٹے کی شاعری کا موازنہ فرمائیں گے۔"

سردار جی: "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میں تو جرمن زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا اور نہ غالب اور گوئٹے کی شاعری سے واقف ہوں۔"

مرزا صاحب: آپ اردو زبان میں، اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو پنجابی زبان میں تقریر فرمائیے۔ بات صرف یہ ہے کہ بولتے جائیے۔ غالب اور گوئٹے کی شاعری سے آپ واقف نہیں تو ان کا نام تو چنداں مشکل نہیں۔ ذرا کہیے تو۔

سردار جی: "غالب گوئٹے ــــ غالب گوئٹے۔"

مرزا صاحب: "بالکل ٹھیک! آپ پاس ہو گئے۔ صرف اتنی بات ہے کہ "غالب انڈ گوئٹے" کہیے۔ انگریزی زبان میں جسے ہم اینڈ کہتے ہیں۔ جرمن میں اسے انڈ کہا جاتا ہے۔"

سردار جی: "غالب انڈ گوئٹے ــــ غالب انڈ گوئٹے۔"

مرزا صاحب: "واہ وا۔ خوب! اب آپ ہندوستان کے بہت بڑے اسکالر ہیں۔ کل برلن کے اخبارات میں اعلان شایع ہو گا کہ ہندوستان کے مشہور اسکالر سردار پریتم سنگھ اتوار کے دن بوقتِ شام ہومبرگ ہال میں "غالب اور گوئٹے" کے موضوع پر ایک زبردست تقریر کریں گے۔ داخلہ ٹکٹ کے ذریعہ ہو گا وغیرہ۔"

سردار جی: "لیکن میں تقریر میں کہوں گا کیا؟"

مرزا صاحب: "جو جی میں آئے کہتے جائیے۔ بس بولتے جائیے اور ہر تین چار جملوں کے بعد "غالب انڈ گوئٹے" کہتے رہیے۔"

اتوار کی شام آ پہنچی۔ ہومبرگ ہال جرمن "اہلِ ذوق" سے کھچا کھچ بھر گیا۔ صدارت

کی کرسی پر برلن کے ایک مشہور ماہرِ ادبیات جلوہ افروز تھے۔ ان کے ایک طرف سردار پریتم سنگھ اور دوسری طرف مرزا کاظم بیٹھے تھے۔ تقریر کا وقت آگیا اور سردار صاحب تقریر کرنے کے لیے اٹھے صاحب صدر نے اٹھ کر حاضرین سے پروفیسر پریتم سنگھ کا تعارف کرایا جس پر ہال خیرمقدم کی تالیوں سے گونج اٹھا۔

سردار صاحب نے اپنی تقریر شروع کی:

"صاحبان! مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلی کے رہنے والے تھے، اردو فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ شراب بہت پیتے تھے اس لیے ان کی عمر تنگ دستی میں گزری۔ دہلی ہندوستان کا دارالسلطنت ہے۔ وہاں ایک گھنٹہ گھر بھی ہے۔ چاندنی چوک میں سودا بیچنے والوں کی صدائیں بہت پیاری ہوتی ہیں ہر طرف سے آوازیں آتی ہیں ——— غالب اَنڈ گوئٹے!"

مجمع نے پرزور تالیاں بجاکر آسمان سر پر اٹھا لیا اور جب تالیوں کی گونج ختم ہوئی تو سردار صاحب نے تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

"دہلی سے تین سو میل کے فاصلے پر لاہور ہے۔ میں ضلع لاہور کا رہنے والا ہوں۔ ہمارا علاقہ بڑا زرخیز ہے۔ پچھلے سال بارشیں کم ہوئی تھیں۔ اسلیے فصلیں اچھی نہ ہوئیں، اس سال گورو مہاراج کی کرپا ہے۔ نہروں میں بھی پانی خوب رہا اور بارشیں بھی اچھی ہوگئیں، امید ہے کہ گیہوں کی فصل اچھی رہے گی۔ لاہور کی بہت سی چیزیں دیکھنے کے لایق ہیں۔ مثلاً بادشاہی مسجد، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ، چڑیا گھر، عجائب گھر، ——— غالب انڈ گوئٹے!"

پھر تالیوں سے فضا گونج اٹھی اور صاحب صدر کے لبوں پر تبسم رقص کرنے لگا۔ آپ نے میز پر ہاتھ مار مار کر مقرر کی "جادو بیانی" کی داد دی۔ سردار صاحب نے اپنی حوصلہ افزائی ہوتی دیکھی تو ذرا زیادہ بلند آواز سے تقریر کرنے

لگے۔ فرمایا:

"غالب انڈ گوئٹے کی بدقسمتی تھی کہ انھوں نے شری دربار صاحب امرتسر کے درشن نہ کیے۔ حتیٰ کہ وہ ضلع گورداسپور بھی نہ جا سکے، ورنہ وہاں کا گڑ کھا کر انھیں نانی سپنے میں یاد آجاتی۔ ضلع امرت سر میں ایک گاؤں چمیاری ہے۔ وہاں کے خربوزے بہت مشہور رہیں، قصور کی میتھی بہت خوشبودار ہوتی ہے اور پھر غالب انڈ گوئٹے کے کیا ہی کہنے گویا انڈیا انڈ جرمنی!"

اس دفعہ سردار نے استاد کے بتائے ہوئے سبق "غالب انڈ گوئٹے" پر "انڈیا انڈ جرمنی" کا اضافہ کر کے کمال کر دکھایا۔ ان الفاظ نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ تالیوں سے ہال گونج اٹھا۔ سردار صاحب نے تقریر جاری رکھی اور دو تین فقرے کہنے کے بعد فرمایا کہ:

"صاحبان! اب غالب کے اشعار بھی سنیے!"

اس مقام پر مرزا کاظم نے اٹھ کر حاضرین سے جرمن زبان میں کہا کہ پروفیسر پریتم سنگھ اب غالب کے چند اشعار سنائیں گے۔ سردار صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں یہ گانا شروع کر دیا:

اساں ہنت دے
فی اساں ہنت دے شرابی رہتائی ہر نام کورے نارے
اددھ وِچ کندھ کر ئے

مرزا کاظم کرسی سے اچھل پڑے، جس پر حاضرین نے تالیوں سے فضا میں گونج پیدا کر دی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب نے ان اشعار کو بے حد پسند کیا ہے۔ سردار صاحب پھر بولے:

اسیں مر گئے

نی اہیں مر گئے کمایاں کر دے نی ہر نام کورے نارے
اجے تیرے بند نہ بنے ۔ ہائے نی اہیں مر گئے

اس دفعہ بھی حسبِ معمول کافی داد ملی ۔ لیکن داد کی حد تو اس وقت ہوئی جب سردار صاحب نے "غالب" کی وہ مثلث "سنائی" جس کی ٹیپ کا مصرعہ یہ تھا :

" موڑیں بابا ڈانگ دا لیا چھئی "

ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا اور سردار پریتم سنگھ مورخ، شاعر اور ماہر ادبیات کی تقریر ختم ہوئی، اس کے بعد مرزا کاظم اٹھے اور انھوں نے نہایت فصیح جرمن زبان میں بیان کیا کہ پروفیسر نے جس قابلیت کے ساتھ غالب اور گوئٹے کا موازنہ کیا ہے شاید ہی آج تک کسی نے کیا ہو ۔ کم از کم برلن میں تو آج تک ایسی تقریر نہ ہوئی ہوگی اور مجھے فخر ہے کہ میرے ملک نے پروفیسر صاحب جیسے آدمی پیدا کیے ہیں ۔ میں اس پوری تقریر کا ترجمہ کر کے برلن کے اخبارات میں شایع کراؤں گا اور آپ دیکھیں گے کہ میرے وطن کے مایہ ناز ماہرِ ادبیات نے علم و فضل کے کیا کیا دریا بہائے ہیں ۔ میں آپ صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے پروفیسر صاحب کے خیالات سننے کی تکلیف گوارا فرمائی ـــــ اس کے بعد صاحبِ صدر اُٹھے اور انھوں نے پروفیسر صاحب اور مرزا کاظم کا شکریہ حاضرین کی طرف سے ادا کیا اور جلسے کے اختتام کا اعلان کیا ۔ پھر کیا تھا ۔ بڑے بڑے ادیب، شاعر، اخبار نویس اور رئیس سردار صاحب سے مصافحہ کرنے کو لپکے اور آپ کو بڑی مشکل سے ہال کے دروازے تک لے جایا گیا ـــــ اسی رات کو مرزا کاظم پروفیسر پریتم سنگھ کو ٹرین پر سوار کرانے کے لیے اسٹیشن تک لے گئے اور دونوں کی جیبیں نوٹوں سے پُر تھیں ۔

فیاض عالم

دیوان غالب صاحب

کردار

دیوانِ غالب: یہ غالب کے کلام کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک عجیب و غریب شخص ہے غالب کا شیدائی، اس کے کلام کا حافظ۔ نثر میں بات کرنا تو گویا جانتا ہی نہیں، غالب کا کلام اس کا اوڑھنا بچھونا ہے، ہر بات غالب کے شعر میں کرتا ہے۔ اسی لیئے دیوان غالبؔ کہلاتا ہے۔

حکیم صاحب: دیوان غالب کے ایک پرانے دوست

وکیل صاحب: " " " " " "

مولوی صاحب: دیوان غالب کے ایک نئے دوست

مجسٹریٹ، سرکاری وکیل، مے فروش، پولیس انسپکٹر، سپاہی، سنتری وغیرہ

پہلا منظر

پردہ اٹھتا ہے

دیوان غالب فقیرانہ لباس میں اس طرح کھڑے ہیں کہ ان کا آدھا چہرہ نظر آرہا ہے ان کی نگاہیں غالب کی تصویروں کا جائزہ لے رہی ہیں۔ فرشی نشست کا سامان ہے، ایک قالین دو تکیے، ایک تپائی رکھی ہے۔ اس پر دیوان غالب کی کئی جلدیں اور انکی

شرحیں رکھی ہوئی ہیں۔ دیوان غالب۔ (تصویروں کی طرف مخاطب ہوکر)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

(پھر وہاں سے چل کر قالین پر آجاتے ہیں اور چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے افسردہ ہوکر)

کاو کاو سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر: (آداب بجالاکر) "حضور میں صدیقی صاحب کے یہاں گیا تھا انھوں نے فرمایا ہے کہ میں آج بھی حاضر نہ ہوسکوں گا۔ بہت مصروف ہوں۔"

دیوان غالب: یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا؛ اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

(نوکر واپس چلاجاتا ہے۔ پھر فوراً ہی داخل ہوتا ہے)

نوکر: حکیم صاحب تشریف لائے ہیں۔ اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

دیوان غالب: وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

(حکیم صاحب لکھنوی لباس میں داخل ہوتے ہیں اور جھک کر فرشی سلام کرتے ہیں)

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

حکیم صاحب کی طرف مخاطب ہوکر

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو ریزش سجدۂ جبین نیاز

(حکیم صاحب بیٹھ جاتے ہیں)

نوکر: "وکیل صاحب تشریف لائے ہیں"

دیوان غالب: یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے

(وکیل صاحب اسٹیج پر نمودار ہوتے ہیں)

کہ غیر جلوۂ گل رہ گزر میں خاک نہیں

وکیل صاحب: (کوٹ پتلون پہنے نشست کے قریب آجاتے ہیں حکیم صاحب اور دیوان غالب کھڑے ہو جاتے ہیں)

"السلام علیکم!"

دیوان غالب: تم سلامت رہو ہزار برس ؛ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

حکیم صاحب: وعلیکم السلام۔ آئیے وکیل صاحب تشریف لائیے۔ کہیئے کیسے حال چال ہیں؟"

وکیل صاحب: بالکل ٹھیک ہے۔ دعا چاہیے آپ کی۔ (دیوان غالب کی طرف مخاطب ہو کر) ماشاء اللہ اب تو آپ بھلے چنگے دکھائی دے رہے ہیں

دیوان غالب: ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق

وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

حکیم صاحب: کیوں کیسی طبیعت ہے آپ کی؟

دیوان غالب: قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا

خوں بھی ذوق درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

وکیل صاحب: کیا ابتک کمزوری باقی ہے؟

دیوان غالب: ضعف سے اے گریہ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں

رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو فشار ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود

قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

وکیل صاحب: کیوں علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا؟

دیوان غالب: درد منت کش دوا نہ ہوا ؛ میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

حکیم صاحب: اچھا تو یہ فرمایئے آپ کو نیند تو اچھی طرح آتی ہے

دیوان غالب: نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

وکیل صاحب: دیوان غالب صاحب! آپ نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ آپ مہاجر ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ فقیرانہ وضع اختیار کر لیں۔

دیوان غالب: بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب ؛ تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر: مولانا خیر الزماں صاحب تشریف لائے ہیں۔

دیوان غالب: حضرت ناصح اگر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

حکیم صاحب: جاؤ ان کو اندر لے آؤ۔

(مولوی خیر الزماں صاحب بڑا سا عمامہ باندھے لمبا سا چوغہ پہنے اور کندھے پر رومال ڈالے داخل ہوتے ہیں اور سب کو سلام کر کے خالی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں)

مولوی صاحب: دیوان غالب صاحب آجکل آپ کیا کر رہے ہیں؟ بیکار کب تک رہیے گا؟ مستقبل کے لیے کوئی فیصلہ کیا ہے یا نہیں؟ کیا سوچا ہے آپ نے؟

دیوان غالب: کوئی دن گر زندگانی اور ہے ؛ اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

حکیم صاحب: آپ نے پچھلے ماہ کوارٹر کے لیے جو درخواست دی تھی اس کا کیا رہا؟ کوارٹر ملنے کی کوئی امید ہے؟

دیوان غالب: (ٹھنڈی آہ بھر کر)
کوئی امید بر نہیں آتی ؛ کوئی صورت نظر نہیں آتی

وکیل صاحب: آپ اطمینان رکھیے ہم جلد ہی آپ کو ایک اچھا سا فلیٹ دلوا دینگے

دیوان غالب: ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن ؛ خاک ہو جائینگے ہم تم کو خبر ہونے تک

وکیل صاحب: مگر وہ کوارٹر جو حکومت آپ کو دیگی بالکل بے کار ہے۔
دیوان غالب: ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب ؛ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے
(مولوی صاحب سر جھکائے خاموش کسی سوچ میں بیٹھے ہیں اور تھوڑی دیر بعد ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں)
دیوان غالب: (مولوی صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر)
دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے   آخر اس درد کی دوا کیا ہے
مولوی صاحب: میں خود مکان کی تلاش میں ہوں مگر کہیں کوئی کوارٹر یا فلیٹ ملتا ہی نہیں۔ اب آپ ہی بتایئے کہ کہاں چل کر رہا جائے۔
دیوان غالب: رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے درو دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو
مولوی صاحب: حکیم صاحب کوئی دوا دیجیے۔ میرا تو فکر کے مارے برا حال ہو گیا۔ ایک ماہ سے رات بھر نیند نہیں آتی۔
دیوان غالب: موت کا ایک دن معین ہے ؛ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
حکیم صاحب: بہت بہتر، کسی روز مطب میں تشریف لایئے، نسخہ لکھ دوں گا۔
دیوان غالب: نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا ؛ کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
مولوی صاحب: (چھیڑنے کے انداز میں) آخر یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے جب دیکھیے غالب کے اشعار پڑھتے رہتے ہیں۔ آخر آپکو غالب سے اس قدر عشق

کیوں ہے؟ غالب میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں وہ ایک شاعر تھا اور سے نوش
بے عمل، زمانہ ساز لیکن آپ ہیں کہ اس کے کلام کو حرز جان بنائے ہوئے ہیں؟

دیوان غالب: (غصہ میں تن کر)
یہ باعث نومیدی ارباب ہوس ہے غالب کو برا کہتے ہو اچّھا نہیں کرتے

مولوی صاحب: آخر غالب نے اپنی زندگی میں کون سے ایسے کارنامے کیے ہیں
جو انسانیت کے لیے مفید ہوں۔ وہ ایک بے فکرا آدمی تھا۔ سوائے شاعری
کے اس میں اور خوبی ہی کیا تھی؟

دیوان غالب: کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن؛ سوائے اسکے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

مولوی صاحب: دنیا میں شاعروں کی کمی نہیں۔ آخر آپ غالب ہی کے پیچھے ہاتھ دھو کر
کیوں پڑے ہیں؟

دیوان غالب: ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے ؛ کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

مولوی صاحب: آپ نے تو غالب کو اپنا پیر و مرشد بنا لیا ہے آخر اس میں ایسی
کون سی خصوصیت ہے؟

دیوان غالب: یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب؛ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مولوی صاحب: مانا کہ غالب کے اشعار میں کہیں کہیں تصوف کی باتیں بھی مل جاتی
ہیں۔ مگر بسا اوقات تو وہ کفر بکنے لگتا ہے۔

دیوان غالب: دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی؛ ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

مولوی صاحب: میری سمجھ میں تو آپکی بات نہیں آئی۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ایک
شخص کسی شاعر کا معتقد ہو تو اس کے کلام کو اوڑھنا بچھونا بنالے اور ہر موقع پر
اس کے اشعار پڑھا کرے۔

دیوان غالب: یا رب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

(دیوان غالب تڑپ کر اٹھتا ہے اور غالب کی بڑی تصویر سے خطاب کرتا ہے)

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے ۔۔۔ ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

(اور پھر اسی طرف رخ کیے کھڑا رہتا ہے)

حکیم صاحب: اجی دیوان غالب صاحب تشریف لایئے۔

مولوی صاحب: دیوان غالب صاحب میں بہت شرمندہ ہوں۔ میرے الفاظ سے آپ کے جذبات کو ٹھیس لگی ہے۔ براہ کرم معاف کر دیجیے۔

دیوان غالب: (ذرا ٹھنڈے ہو کر)

نہ ڈر ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

گریباں کو اس طرح کھینچتے ہوئے گویا اب پھاڑ ڈالیں گے واپس آتے ہیں اور اپنی جگہ آ کر بیٹھ جاتے ہیں)

حکیم صاحب: (موضوع بدل کر) دیوان غالب صاحب! فرمایئے اب آپ کو اپنا کلکتہ بھی یاد آتا ہے، اس کی گلیاں، اس کی سڑکیں اور وہاں کے دل فریب مناظر۔

دیوان غالب: (کیف و سرمستی کے عالم میں)

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں ۔۔۔ اک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب ۔۔۔ وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ انکی نگاہیں کہ حف نظر ۔۔۔ طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ ۔۔۔ وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

(دیوان غالب بیخودی کے عالم میں مسلسل جھومتے اور ہائے ہائے کرتے جاتے ہیں)

حکیم صاحب: افوہ معلوم ہوتا ہے کہ دورہ پڑ گیا ہے ان پر۔ نوکر کو بلاؤ (نوکر

داخل ہوتا ہے اور دیوان غالب کا یہ حال دیکھ کر بھاگا جاتا ہے اور شراب کی بوتل اور گلاس لیے ہوئے آتا ہے۔ ایک گلاس بھر کر دیوان غالب کے منھ سے لگا دیتا ہے۔ جس کو دیوان غالب ایک ہی سانس میں پی جاتا ہے۔ پھر قدرے ہوش آ جاتا ہے۔ مولوی صاحب کو شراب کی بو آتی ہے وہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں)

دیوان غالب: (مستی کے عالم میں ہاتھ بڑھا کر اور شراب مانگتے ہیں)

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں　　یہ سوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

(نوکر ایک گلاس اور بھر کر دیتا ہے، گلاس ہاتھ میں لیکر خوش ہو کر مستی کے عالم میں)

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا　　سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

اور خالی گلاس مولوی صاحب کے پاس رکھ دیتا ہے۔

مولوی صاحب: یک بیک پیچھے ہٹ کر" استغفر اللہ، آپ شراب پیتے ہیں؟ آپ کو معلوم ہے کہ تمام مہاجرین کا کیا حال ہے؟ ان کو پیٹ بھرنے کے لئے روٹی اور تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا میسر نہیں اور آپ شراب سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔"

دیوان غالب: مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

وکیل صاحب: اچھا اب پتہ چلا کہ آپ شراب کیوں پیتے ہیں۔ اس بیخودی کے پردے میں کوئی گہرا راز پنہاں ہے۔

دیوان غالب: (مسکرا کر)

بے خودی بے سبب نہیں غالب　　کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

حکیم صاحب: ہوں...... وہ گہرا معاملہ بھی کچھ عشق وغیرہ سے متعلق

معلوم ہوتا ہے۔

دیوان غالب: کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

حکیم صاحب: دیکھیے دیوان غالب صاحب! شراب کی بدولت آپ کی یہ حالت ہوئی بہتر ہے کہ آپ شراب سے توبہ کرلیں۔

دیوان غالب: یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

وکیل صاحب: آپ شراب پیتے ہیں وہ بھی قرض کی۔ دیوان غالب صاحب! یہ مشغلہ ترک کر دیجیے ورنہ دفعہ ۳۱۲ کے تحت دو سال کے لیے دھر لیے جائیں گے۔ کیوں اپنے ہاتھوں اپنا گھر برباد کرتے ہیں۔

دیوان غالب: نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

مولوی صاحب: آپ کو اپنے گھر کے خراب ہونے کی پروا نہیں ہے لیکن اپنی عاقبت کیوں خراب کرتے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ مے خواروں کے لیے جنت میں کوئی جگہ نہ ہوگی،

دیوان غالب: ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مولوی صاحب: اور آپ اس غم عشق ہی سے کیوں نہ کنارہ کش ہو جائیں جس نے آپ کو مے نوشی پر مجبور کیا ہے۔

دیوان غالب: غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

(ذرا رک کر) عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

(نوکر ایک خط لاتا ہے اور دیوان غالب کو دیکر کھڑا ان کو دیکھتا رہتا ہے)

دیوان غالب: (خط لے کر بہت خوش ہو کر)
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا   جاں نذرِ دلفریبیٔ عنواں کیے ہوئے
(خط لے کر پڑھتے ہیں)

وکیل صاحب: "کہیے کیا لکھا ہے خط میں؟"

دیوان غالب: ایک جا حرف وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے
(نوکر کی طرف دیکھ کر)
دے کے خط منھ دیکھتا ہے نامہ بر، کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

نوکر: حضور انھوں نے کہا ہے کہ پرسوں شام کو آرام باغ کی سیر کو چلیں گے آپ بھی پانچ بجے آجائیے۔

دیوان غالب: وعدۂ سیر گلستاں ہے خوشا طالع شوق
مژدہ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں
(اتنے میں ایک اور صاحب آکر بیٹھ جاتے ہیں)

حکیم صاحب: بھئی واہ! خوب موقع سے تشریف لائے آپ، بھئی اس خوشی کے موقع پر تو غالب کی کوئی چیز ہو جائے۔

وکیل صاحب: ہاں ہاں! ضرور ضرور!!

دیوان غالب: (اس شخص کی طرف مخاطب ہو کر)
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں   آج غالب غزل سرا نہ ہوا

وہ شخص: ترنم سے غالب کی غزل پڑھتا ہے:

ابن مریم ہوا کرے کوئی | میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی | ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر | دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے | وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ | کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سنو گر برا کہے کوئی | نہ کہو، گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی | بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند؟ | کس کی حاجت روا کرے کوئی؟
کیا کیا خضر نے سکندر سے! | اب کسے رہنما کرے کوئی؟

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

(غزل ختم ہوتی ہے۔ اتنے میں نوکر گھبرایا ہوا اندر داخل ہوتا ہے)

نوکر: "صاحب وہ دوکاندار سپاہیوں کو لیکر آیا ہے خدا جانے کیا بات ہے۔"

وکیل صاحب: "یہاں بھیج دو ان سب کو۔"

(مے فروش ڈگری لیے ہوئے سپاہیوں اور انسپکٹر کے ساتھ داخل ہوتا ہے)

مے فروش: (دیوان غالب کی طرف اشارہ کرکے) "یہ ہیں صاحب وہ"

انسپکٹر: (آگے بڑھ کر وارنٹ دکھاتے ہوئے) میں آپکو دفعہ ۱۲ کے تحت گرفتار کرتا ہوں۔

مولوی صاحب: ارے کیا بات ہے کچھ بتاؤ تو سہی۔

مے فروش: (دیوان غالب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ ان ہی سے

پوچھ لیجیے۔

(مولوی صاحب مستفسرانہ انداز میں دیوان غالب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں)

دیوان غالب: (نہایت ہی یاس بھرے لہجے میں)

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایکدن

مے فروش ۔ ہمیں ان سے کوئی دشمنی تو نہیں ہے ہم کو تو اپنی رقم وصول کرنی ہے۔

ہم تو انہیں اپنا دوست سمجھ کر سالہا سال سے شراب قرض دیتے رہے۔

دیوان غالب: یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

(سپاہی دیوان غالب کو لے کر چلتے ہیں)

نوکر: (رو کر) حضور ہمیں کس پر چھوڑ جاتے ہیں؟

حکیم صاحب: "ہائے دیوان غالب صاحب! آپ نے ہمارا کہنا نہیں مانا اور معاملہ یہاں تک پہنچا"

وکیل صاحب: ہائے آپ کے بغیر تو ہماری مجلسیں سونی ہو جائیں گی۔

دیوان غالب: غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

دوسرا منظر

(سپاہی دیوان غالب کو ننگے پاؤں اپنی حراست میں لیے جاتے ہیں پیچھے پیچھے دیوان غالب کے تینوں دوست سر جھکائے چلے آتے ہیں)

دیوان غالب: ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں

جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

(تمام لوگ اسٹیج کے دائیں کونے پر آ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے مگر پھر

فوراً ہی اٹھ جاتا ہے۔ منظر میں کوئی تبدیلی نہیں۔ سپاہی مع قیدی دائیں کونے سے نکلتے ہیں مگر وکیل صاحب نظر نہیں آتے۔)

سپاہی: (ڈانٹ کر) "جلدی جلدی چلو"

دیوان غالب: چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

(تمام لوگ اسٹیج کے بائیں کونے میں غائب ہو جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے دوسرے ہی لمحہ پھر اٹھ جاتا ہے مگر اس دفعہ مولوی صاحب اور حکیم صاحب بھی غائب ہو جاتے ہیں)

دیوان غالب: (ایک دم پیچھے گھوم کر دیکھتا ہے)
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے   تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

(راستے میں دیوان غالب کا ایک اور دوست مل جاتا ہے)

دوست: "ارے یہ کیا معاملہ ہے؟"

دیوان غالب: پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے : اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

دوست: اب کہاں جا رہے ہو؟

دیوان غالب: لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

تیسرا منظر

(تھانے میں تھانیدار صاحب ایک کرسی پر بیٹھے ہیں۔ سامنے میز پر کچھ فائل، کاغذات، رجسٹر اور لکھنے پڑھنے کا سامان رکھا ہے۔ وہ لکھنے میں مصروف ہیں کہ سپاہی دیوان غالب کو لے کر حاضر ہوتے ہیں۔)

تھانیدار: (دیوان غالب کو گھور کر سپاہیوں سے مخاطب ہو کر) "اچھا یہی ہے دیوان غالب، بہت ہی برا آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

دیوان غالب: لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے؛ یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

تھانیدار: (سپاہیوں سے) لے جاؤ اس کو حوالات میں بند کر دو۔ چند دنوں میں حوالات کی ہوا کھا کر حضرت کے مزاج درست ہو جائیں گے؛

(سپاہی دیوان غالب کو لے چلتے ہیں۔ تھوڑے فاصلہ پر دیوان غالب تھانیدار کی طرف منہ کر کے)

دیوان غالب: گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

(تھانیدار سن لیتا ہے اور غصہ میں کرسی سے اٹھ کر دیوان غالب کے پاس آتا ہے)

تھانیدار: یہ کیا بکتے ہو جی تم؟

دیوان غالب: بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ؛ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

تھانیدار: ابھی تم نے مجھے کیا کہا تھا؟

دیوان غالب: روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

تھانیدار: تم بڑے بدطینت آدمی معلوم ہوتے ہو۔

دیوان غالب: قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

(تھانیدار مطمئن ہو کر چلا جاتا ہے)

دیوان غالب: (تھانیدار کی طرف منہ کر کے)
دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

چوتھا منظر

(حوالات کی سلاخوں کی دوسری طرف دیوان غالب کھڑے ہیں۔ سنتری بندوق کاندھے پر رکھ کر پہرہ دے رہا ہے۔ حکیم صاحب آتے ہیں۔ دیوان غالب کو اشارے سے سلام کرتے ہیں۔ دیوان غالب بھی اشارے سے جواب دیتے ہیں۔ حکیم صاحب مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ دیوان غالب بھی اپنا ہاتھ سلاخوں سے باہر نکالتے ہیں اور مصافحہ کرتے ہیں)

حکیم صاحب : دیوان غالب صاحب آپ کے آنے کے بعد کیا بتاؤں کہ آپکے گھر کا کیا حال ہو گیا ہے (کہتے کہتے رک جاتے ہیں)

دیوان غالب : قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

حکیم صاحب : آپ کیا چلے کہ گھر ویران ہو گیا اور ہماری بزم کی رونق ہی ختم ہو گئی

دیوان غالب : یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

حکیم صاحب : کہیے یہاں کیا حال ہے آپ کا۔ جی تو بہت گھبراتا ہوگا

دیوان غالب : خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتار بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا
بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

حکیم صاحب : آپ کو یہاں زیادہ تکلیف تو نہیں ؟

دیوان غالب : قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنج گراں باری زنجیر بھی تھا

(پھر یک بیک دیوان غالب کی آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہیں اور رومال سے آنسو پونچھنے لگتے ہیں)

حکیم صاحب: آپ روتے کیوں ہیں؟

دیوان غالب: دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئیں کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

حکیم صاحب: لیکن اگر آپ اسی طرح روتے رہے تو آپ کا حال اور برا ہو جائے گا

دیوان غالب: یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

حکیم صاحب: اچھا دیوان غالب صاحب آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔

دیوان غالب: جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

(سپاہی آتا ہے)

سپاہی: تمہارے مقدمہ کی تاریخ ۱۰؍اپریل پڑی ہے۔ اس دن تمہیں عدالت میں چلنا ہوگا۔

دیوان غالب: مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

(سپاہی واپس چلا جاتا ہے۔ حکیم صاحب دیوان غالب سے ہاتھ ملا کر چل رہے ہیں)

دیوان غالب: زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پانچواں اور آخری منظر

(عدالت کا منظر، جج ایک اونچی کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ سامنے ایک میز ہے۔ اس پر ضروری کاغذات قائل وغیرہ ہیں۔ ایک ہتھوڑا بھی رکھا ہوا ہے، جج کی میز کے پاس ہی کلرک بیٹھا ہے۔ اس کے پاس بھی کاغذات ہیں۔ سرکاری وکیل اور دیوان غالب کے احباب اور ان کا ملازم بھی عدالت میں موجود ہیں۔ دیوان غالب کٹہرے میں کھڑے ہیں)

دیوان غالب: پھر کھلا ہے در عدالت ناز — گرم بازار فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر — زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا — آج پھر اسکی روبکاری ہے

جج: تھانیدار اپنی رپورٹ پیش کرے۔

تھانیدار: (ملزم کی طرف اشارہ کر کے) یہ ہیں وہ صاحب جو مدتوں سے سالہا سال سے شراب قرض لیکر پیتے رہے ہیں۔ جیب میں کھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ دس روپے روزانہ صرف شراب کا خرچ تھا۔ اصل نام کسی کو معلوم نہیں۔ بس دیوان غالب کے نام سے آپ کو مشہور کر رکھا ہے بات بھی نثر میں نہیں کرتے ہر بات کے جواب میں غالب ہی کے اشعار پیش کرتے ہیں۔ کلکتے سے فسادات کے دوران میں یہاں آ کر آباد ہو گئے کچھ کام کرتے نہیں، خالی بیٹھے یا تو دن بھر شراب پیتے رہتے ہیں۔ یا دوستوں کو جمع کر کے دھاچوکڑی مچاتے ہیں (انسپکٹر واپس چلا جاتا ہے اور سرکاری وکیل اٹھ کر ملزم سے سوال کرتا ہے)

سرکاری وکیل: (ملزم سے مخاطب ہو کر) تمہارا نام کیا ہے؟ کہاں رہتے

سو اور کیا کام کرتے ہو ؟

دیوان غالب : ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

سرکاری وکیل : اچھا میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں ۔ براہ کرم یہ بتایئے کہ آپ کون ہیں اور آپکا نام کیا ہے ؟

دیوان غالب : پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے ؛ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

سرکاری وکیل : آپ کا گھر کہاں ہے ؟

دیوان غالب : گھر جب بنا لیا ہے ترے در پہ کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

سرکاری وکیل : آپ بھی خوب آدمی ہیں ۔ مانا کہ آپ کا موجودہ گھر تو حوالات ہی ہے لیکن اس سے پہلے بھی آپ کا کہیں گھر تھا یا نہیں ؟"

دیوان غالب : خانۂ مجنون صحرا گرد ، بے دروازہ تھا ۔

سرکاری وکیل : خیر گھر کا پتہ تو لگ ہی جائے گا ، لیکن اپنا پیشہ تو بتایئے ؟

دیوان غالب : سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

سرکاری وکیل : خیر یہ تو آپ کے آبا کا پیشہ رہا ہوگا لیکن آپ کیا کام کرتے ہیں ؟

دیوان غالب : عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

سرکاری وکیل : آپ پر یہ الزامات عاید کیے گئے ہیں کیا آپ کو ان کی صحت کا اقرار ہے ۔

دیوان غالب : کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

سرکاری وکیل: (دیوان غالب کے جوابات سن کر غصہ میں ٹہلتا ہے، پھر جج سے مخاطب ہوکر) "می لارڈ! یہ عجیب بے وقوف قسم کا آدمی ہے کتنے بے تکے جواب دے رہا ہے، یہ یا تو پاگل ہے یا ہم سب کو پاگل بنانا چاہتا ہے۔ می لارڈ! اس ملزم کو خاطر خواہ سزا ملنی چاہیے۔ یہ نثر میں بولتا ہی نہیں بے معنی اشعار جواب میں پڑھ ڈالتا ہے۔

دیوان غالب: نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

جج: (میز پر ہتھوڑا بجاتا ہے) "آرڈر! آرڈر! ملزم زبان سنبھال کر بات کرو، یہ کمرۂ عدالت ہے محفل مشاعرہ نہیں!"

دیوان غالب: قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

سرکاری وکیل: "می لارڈ! یہ ملزم بہت ہی خطرناک قسم کا آدمی ہے اس نے مدعی کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ مدعی اس کو شریف سمجھ کر شراب قرض دیتا رہا۔ یہاں تک کہ کئی سال گزر گئے اور ایک کثیر رقم ملزم پر چڑھ گئی۔ مدعی نے عدالت سے چارہ جوئی کی، عدالت سے اس کو ڈگری ملی، لیکن ملزم رقم کی ادائیگی میں حیلہ حوالہ سے کام لیتا رہا، اس لیے اس کو گرفتار کر کے دوبارہ عدالت میں حاضر کیا گیا۔ می لارڈ ان مہاجرین کا عجیب حال ہے۔ یہ کماتے ہیں، دولت اکٹھی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مفلس اور قلاش ظاہر کرتے ہیں اس طرح

لوگوں کو دھوکا دینا ان کا شیوہ ہوگیا ہے۔ ملزم بھی اسی قسم کے لوگوں میں سے ہے۔ می لارڈ! مدعی کا دعویٰ اس کے خلاف ثابت ہے اس لیے قانوناً یا تو ملزم سے روپے وصول کیے جائیں یا عدم ادائیگی کی صورت میں اس کو جیل کی ہوا کھانے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔

جج : "ملزم تم جو کچھ کہنا چاہو کہو"

دیوانِ غالب : منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سرکاری وکیل: می لارڈ! ملزم نثر میں بات کیوں نہیں کرتا۔ اگر اس نے بار بار تنبیہ کرنے پر بھی نثر میں بات نہیں کی تو اس کے خلاف توہین عدالت کا دوسرا مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔

دیوانِ غالب کا وکیل: می لارڈ! ایکسکیوز می اِف یو ڈونٹ مائنڈ۔ اشعار میں عدالت کے سوالات کے جواب دینا کسی بھی قانون کی رو سے توہین عدالت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عدالت کے پاس کوئی ایسی دفعہ نہیں ہے جس کی رو سے وہ کسی خاص طرز میں بیان دینے پر مجبور کر سکے۔

جج : ملزم اپنا بیان جاری رکھے۔

دیوانِ غالب : پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

جج : تم قرض کی ادائیگی میں حیلے حوالے سے کیوں کام لے رہے ہو۔ سیدھے طریقے سے قرض ادا کیوں نہیں کرتے؟

دیوانِ غالب : صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے!

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

جج: تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم بالکل مفلس اور قلاش ہو۔ کیا تم اپنے دعوے کی تصدیق کے لیے گواہ پیش کر سکتے ہو؟

دیوان غالب: صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

جج: لیکن خدا کو گواہی کے لیے عدالت میں کس طرح لایا جاسکتا ہے۔ اس لیے اگر تم اپنے دعوی کو ثابت نہ کر سکے تو تمہیں جیل کی ہوا کھانی پڑیگی۔

دیوان غالب: حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

دیوان غالب کا وکیل: انسان کی زندگی میں بعض لمحے ایسے آتے ہیں کہ اس کا نظام زندگی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ چند سال پہلے جو ہولناک حادثات ہوئے ان سے کون ناواقف نہیں۔ می لارڈ! ملزم کا گھر فسادات میں لٹ گیا۔ اس کا خاندان تباہ و برباد ہو گیا۔ ملزم کو ترک وطن کر کے یہاں آنا پڑا ان حادثات کا ان کے دماغ پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ یہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے اور اپنا غم غلط کرنے کے لیے شعر و ادب کا مشغلہ شروع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص کیا دولت کما سکتا ہے، اور کیا پس انداز کر سکتا ہے مدعی کی غفلت ہے کہ وہ ان حالات میں مدعا علیہ کو انجام سے بے خبر ہو کر شراب قرض دیتا رہا۔ می لارڈ ملزم کے پاس کوئی رقم نہیں جس سے وہ قرض ادا کر سکے۔ اس کے بچے نانِ شبینہ کو محتاج ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کن کن دشواریوں میں اس کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ عدم ادائیگی کی صورت

میں اُس ملزم کو جیل کی سزا دینا مناسب ہے جس کا دماغی توازن صحیح ہو تاکہ اسے عبرت حاصل ہو اور آئندہ ایسی حرکت سے باز رہے۔ لیکن جس کا دماغی توازن ہی صحیح نہ ہو اس کو کیا عبرت ہو گی۔ اس لیے کہ جو کچھ اس نے کیا ہے قصد و ارادہ سے نہیں کیا ہے لہٰذا می لارڈ ایسے ملزم کو سزا دینا شرط انصاف نہیں ہے۔ می لارڈ اگر ملزم کے حالات پر ہمدردی سے غور کیا جائے تو ہر شخص یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گا کہ ملزم کو بری کر دیا جائے

جج : (فیصلہ لکھتا ہے پھر سناتا ہے) "تھانیدار کے بیان اور ملزم کے حالات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ملزم کا دماغ صحیح نہیں ہے، اس لیے ملزم کو بری کیا جاتا ہے۔

(ایک سپاہی ملزم کو واپس لاتا ہے اور اسٹیج کے بیچ میں اسے چھوڑ کر ایک ہاتھ سے ذرا دھکا دیتا ہے)

دیوان غالب : نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

اسی سلسلے کی چند دوسری کتابیں

اگلے صفحات پر!

عوامی لائبریری کے مشہور و مقبول سلسلے کی

دوسری کم خرچ کتابوں

کی تفصیلات

ملاحظہ فرمائیے

کتاب کار (پبلیکیشنز) رامپور یوپی

پری خانہ

اودھ کے آخری تاجدار رنگیلے پیا جان عالم واجد علی شاہ اختر کی شخصیت تاریخ میں ہمیشہ دلچسپ اور پرکشش رہی ہے ـــــــ وہ ایک عیاش حکمراں تھے عورت ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی راگ رنگ کی محفلیں اور جام و سبو کی گردشیں ان کی زندگی کا سب سے نمایاں مشغلہ تھیں ـــــــ جان عالم اختر کیا تھے کیسے تھے خود ان کی زبانی سنیے حرم سرا کی خود نوشت رنگین داستان میں انھوں نے فرانس کے انقلابی مفکر روسو کی طرح بڑی بے باکی سے اپنی تمام جنسی کمزوریوں کا اعتراف کیا ہے۔ قیمت ۲ روپے

چچا چھکن

اردو ادب میں سرشار کے خوجی کے بعد وہ دوسرا مزاحیہ زندہ کردار جس کی نقش گری کا سہرا مشہور ادیب سید امتیاز علی تاج کے سر ہے۔ چچا چھکن کی بدحواسیاں آج ضرب المثل بن چکی ہیں اور اس جاندار شخصیت نے اتنی مقبولیت پائی ہے کہ بہت سے لکھنے والوں نے تاج کی تقلید میں چچا چھکن پر طبع آزمائی کی ہے۔ ع مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی یہ کتاب عرصے سے ہندوستان میں نایاب تھی۔ اب عوامی لائبریری سیریز کے کم خرچ سیٹ میں اسے بڑے اہتمام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ قیمت سوا روپیہ

جانوروں کی نفسیاتی کہانیاں

یہ کتاب ایسی کہانیوں پر مشتمل ہے جو جانوروں کی نفسیات سے گہرا تعلق رکھتی ہیں اور اس اعتبار سے اردو زبان میں ایک اضافہ کہی جا سکتی ہیں، سید رفیق حسن نے برسوں کے مطالعے اور جنگل کی شکاری زندگی بسر کرنے کے بعد قلم اٹھایا ہے اور اس ہنرمندی سے کہانیوں کی شکل میں جانوروں کی نفسیات کو پیش کیا ہے کہ کتاب ایکبار شروع کر کے ختم کیے بغیر نہیں چھوڑی جا سکتی۔ قیمت دو روپے۔

کتاب کار پبلیکیشنز، رامپور، یوپی

رسوم دہلی

تہذیب و تمدن عبارت ہے۔ ان رسموں اور رواجوں سے جو انسانی سماج کا جزو اعظم ہیں۔ ہر ملک اور قوم کی رسمیں جدا جدا ہوتی ہیں۔ دلی کی تہذیب اس برصغیر میں مسلمانوں کی ہزار سالہ معاشرت کا مرکزی تصور پیش کرتی ہے۔ شعر و ادب میں، موسیقی میں فن تعمیر میں اس شہر کی داستان تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔ اس میں التمش کے زمانے سے بہادر شاہ ظفر تک مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کی تمام نیرنگیاں موجود تھیں۔ بغداد اور اصفہان کی طرح دلی کی بھی چار دانگ عالم میں شہرت تھی۔ دلی کے سواد میں روشنی تھی۔ رنگ تھا۔ میلے ٹھیلے تھے۔ رسوم کی بوقلمونی اور رنگا رنگی تھی۔ یہ کتاب دلی کے مسلمانوں کی بھرپور زندگی کے رسم و رواج کا حافظ ہے۔

اس کتاب کے مصنف ہیں سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ جن کا نام کتاب کے مستند ہونے کا ثبوت ہے۔ قیمت دو روپے۔

تاج کے ڈرامے انارکلی پر ایک نظر

اردو کا شاید ہی کوئی پڑھا لکھا ایسا ہو جس نے سید امتیاز علی تاج کے ڈرامے انارکلی کو ایکبار نہ پڑھا ہو ـــــ انارکلی کو اردو ڈرامے کا سنگ میل شمار کیا جاتا ہے اور یہ آج ہند و پاک کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں کے اردو کورس میں شامل ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ابھی تک اس پر کوئی مفصل تنقید نہیں لکھی گئی عوامی لائبریری سیریز میں "انارکلی پر ایک نظر" کے عنوان سے ایک طویل تبصرہ شایع کیا گیا ہے جس میں اس ڈرامے کے سارے پہلوؤں پر بے لاگ ہو کر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

یقین ہے کہ یہ کتاب اردو ڈرامے میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے عموماً اور اردو ڈرامے کے طالب علموں کے لیے خصوصاً مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔ قیمت ایک روپیہ

کتاب کار پبلیکیشنز، رامپور یوپی